
دستک
انوار صدیقی

ترتیب

"نہلے پہ دہلا"

جوزف نے جس وقت گھر میں قدم رکھا اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ کسی شدید ذہنی الجھن سے دوچار ہے۔ اس کی خوبصورت اور حسین و جمیل بیوی روزی کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی جس سے وہ متاثر ہوتی۔ گزشتہ ایک ڈیڑھ ماہ سے وہ جوزف کو متواتر اسی کیفیت سے دوچار دیکھ رہی تھی' ایک دو بار اس نے جوزف سے اسکی وجہ بھی دریافت کی لیکن جوزف ہمیشہ ٹال گیا۔

روزی اور جوزف کو رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے سات سال کا عرصہ گزر چکا تھا اس تمام عرصے میں روزی نے جوزف کو ہمیشہ بیحد خوش مزاج اور زندہ دل پایا تھا۔ ان کے درمیان کبھی جھگڑا بھی نہیں ہوا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ جوزف کی ماہانہ آمدنی دس ہزار سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ چنانچہ دونوں میاں بیوی کی گزر بڑے شاندار طریقے سے ہو رہی تھی' صرف یہی نہیں بلکہ وہ ہر ماہ ایک اچھی خاصی رقم پس انداز بھی کر لیتے تھے۔

جوزف اٹھائیس سال کا ایک تنومند اور خوبرو جوان تھا۔ روزی سے اس کی پہلی ملاقات کرسمس کے موقع پر ایک نائٹ کلب میں ہوئی تھی نگاہوں ہی نگاہوں میں دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا پھر جوزف نے روزی سے ہم رقص بننے کی درخواست کی جسے روزی نے دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ قبول کر لیا۔ اس کے بعد وہ بہت جلد ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے جس کا نتیجہ شادی کی صورت میں ظاہر ہوا اور اب وہ دونوں سات سال سے بڑی خوشگوار اور آسودہ حال زندگی گزار رہے تھے۔ جوزف دل و جان سے روزی کو روز اول کی طرح پیار کرتا تھا۔ ان کے درمیان کبھی کوئی نا چاقی نہیں ہوئی تھی لیکن گزشتہ ایک ڈیڑھ ماہ سے ان کے درمیان

ایک نامعلوم خلیج پیدا ہو گئی تھی جس کی وجہ کم از کم روزی کی سمجھ سے باہر تھی۔

شروع شروع میں روزی نے جوزف کے روکھے رویے کو اس کی مصروفیت سمجھ کر نظر انداز کر دیا لیکن جب جوزف کا چڑچڑا پن بڑھتا چلا گیا تو اسے تشویش ہوئی۔ وہ ہر قیمت پر جوزف کی اس اچانک تبدیلی کی وجہ جان لینے کے لئے بے چین تھی۔ پندرہ بیس روز تک وہ خاموشی سے اپنی تگ و دو میں لگی رہی پھر ایک روز اتفاقیہ جوزف کے چڑچڑے پن کی وجہ اسے معلوم ہو گئی۔ وہ بھی کرسمس ہی کا موقع تھا جب وہ گھر کی صفائی میں مصروف تھی۔ جوزف کی بینک کی کتاب محض اتفاقیہ طور پر اس کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا تھا کہ گزشتہ ڈیڑھ ماہ میں جوزف نے ہر ہفتے دو ہزار کی رقم نکلوائی ہے۔ ممکن تھا کہ روزی اس ضمن میں یہی نتیجہ قائم کرتی کہ جوزف کو بزنس کے سلسلے میں اس رقم کی ضرورت پیش آئی ہو گی لیکن یہ عقدہ بھی اس وقت حل ہو گیا جب روزی کو جوزف کی چیک بک کے ساتھ ہی رکھا ہوا ایک ٹائپ شدہ خط مل گیا جس کی تحریر اس کے لئے یقیناً" معنی خیز اور اہم تھی۔ خط کا مضمون تھا۔

ڈیر مسٹر جوزف۔

گزشتہ ہفتے تم نے رقم کی ادائیگی دیر سے کر کے معاہدے کی خلاف ورزی کی تھی۔ امید ہے کہ آئندہ تم ایک سمجھدار آدمی کی حیثیت سے اس قسم کی حماقت کا ثبوت نہیں دو گے! مونیکا کے سلسلے میں تم آجکل جس خوش فہمی کا شکار ہو اسے اپنے ذہن سے نکال دو۔ وہ جس قسم اور کردار کی لڑکی ہے اس سے سب ہی واقف ہیں ——— بہر حال اگر تم نے کسی لمبی رقم کا لالچ دے کر اسے ہموار کر لیا تب بھی تمہیں کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ جو چیزیں میرے پاس موجود ہیں ان کی تشہیر یقیناً" تمہارے لئے نقصان دہ ثابت ہو گی! ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو کہ اگر روزی کو ان باتوں کا علم ہو گیا تو کیا ہو گا؟ کیا میں توقع رکھوں کہ تم آئندہ میرے مشورے پر عمل کرو گے؟ ——— اس ہفتے کی رقم عین وقت پر بھیجنے کے

سلسلے میں تمہارا بہت شکریہ۔

تمہارا۔ بہی خواہ

روزی نے ٹائپ شدہ خط کو دو تین بار بہت غور سے پڑھا۔ شوہر کے چڑچڑے پن کی وجہ کسی حد تک اس کی سمجھ میں آ چکی تھی اس نے جلدی جلدی الماری کی تمام چیزیں قرینے سے رکھیں پھر شوہر کے کمرے سے باہر آ گئی۔ وہ تین دنوں تک وہ مونیکا کے بارے میں سوچتی رہی پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ جوزف سے کھل کر بات کرے گی۔ چنانچہ آج جس وقت جوزف نے گھر میں قدم رکھا تو اس نے بڑے تپاک سے آگے بڑھ کر ایک دلنواز ادا کے ساتھ اسے خوش آمدید کہا لیکن جوزف حسب معمول گردن جھکا کر آگے بڑھ گیا۔

"تم ایک ڈیڑھ ماہ سے کچھ پریشان نظر آ رہے ہو" کھانے کی میز پر روزی نے شوہر کو کریدا۔

"یوں ہی بزنس کے کچھ معاملات الجھ گئے ہیں اور کوئی خاص بات نہیں" جوزف نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

"کاروبار میں تو اونچ نیچ ہوتی ہی رہتی ہے لیکن ایسا بھی کیا کہ انسان ہر وقت کھویا کھویا رہے۔"

"فکر مت کرو ——— چند دنوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا" جوزف نے بدستور خشک لہجے میں جواب دیا۔

روزی بڑے غور سے شوہر کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ کچھ توقف کے بعد اس نے پھر کہا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ تم کسی اور الجھن میں پھنس گئے ہو۔"

"کیا ———؟" جوزف چونک پڑا ——— "اور الجھن سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"ہو سکتا ہے کہ تمہاری پریشانی کی کوئی خاص وجہ ہو جو تم مجھے نہ بتانا چاہتے ہو۔" روزی نے زیر لب مسکرا کر جواب دیا۔

"کیا تمہیں اب مجھ پر اعتماد نہیں رہا۔" جوزف نے تنک کر کہا۔

"مجھے تو تم پر روز اول کی طرح آج بھی مکمل اعتماد ہے لیکن۔"

"لیکن کیا ------" جوزف نے تیزی سے پوچھا۔ روزی کے نامکمل جملے نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔

"آج میں نے پورے گھر کی صفائی کی تھی۔"

"پھر۔"

"اتفاق سے تمہارے بینک کی چیک بک میرے ہاتھ آ گئی" روزی نے دھیلے لہجے میں کہا۔ "گزشتہ ڈیڑھ ماہ کے عرصے میں تم نے تقریباً" بارہ ہزار کی رقم اپنے حساب سے نکلوائی ہے۔"

"اوہ ------" جوزف نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ رقم مجھے بزنس کے سلسلے میں نکلوانی پڑی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم آجکل جو بزنس کر رہے ہو اس میں نقصانات کے امکانات زیادہ ہیں۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو۔" جوزف دوبارہ چونکا۔

"میں تمہارے اس بہی خواہ کا خط پڑھ چکی ہو جس نے تمہیں مونیکا سے دور رہنے کا مشورہ دیا ہے۔"

"اوہ ------" جوزف گڑبڑا گیا۔ چند لمحے وہ کھوئی کھوئی نظروں سے روزی کو دیکھتا رہا پھر تھکے ہوئے لہجے میں بولا ------ "میں نہیں چاہتا تھا کہ تم ان واقعات سے واقف ہو لیکن اب جب کہ حالات کا علم تمہیں ہو چکا ہے تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہتا ہوں۔"

پھر کھانے کے دوران میں ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ روزی نے بھی شوہر کو مزید کریدنا مناسب نہیں سمجھا بعد میں جب جوزف کھانے سے فارغ ہو کر اپنی خواب گاہ میں گیا تو روزی بھی اس کے ساتھ تھی۔

"جان من ------" جوزف نے کچھ سوچ کر کہنا شروع کیا ------" مونیکا کے سلسلے میں تم کو صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ وہ ایک بدکردار عورت ہے لیکن میں مقدس مریم کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس سے کبھی کوئی ناجائز تعلقات نہ پہلے تھے

نہ اب ہیں ------ ہاں یہ ضرور ہے کہ حالات نے مجھے اس کے ذریعہ ایک ایسی مصیبت میں پھانس دیا ہے کہ میں بے بس ہو گیا ہوں۔"

"لیکن خط سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تم اب بھی مونیکا سے ملتے رہتے ہو۔"

"ہاں ------" جوزف ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "میں ایسا کرنے کے لئے مجبور ہوں۔ مونیکا اگر آمادہ ہو جائے تو میں ایک بڑی مصیبت سے نجات حاصل کر لوں گا۔"

"لیکن اصل معاملہ کیا ہے۔" روزی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اصل معاملہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ چند افراد مونیکا کی شخصیت کو درمیان میں لا کر مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہیں۔" جوزف نے کہا۔ "ان افراد نے مجھے اس بات کی دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے ہر ہفتے انہیں دو ہزار کی رقم ادا نہیں کی تو وہ مجھے بدنام کریں گے اور ------ ہو سکتا ہے کہ ان چیزوں کے سامنے آنے کے بعد تم بھی مجھ سے بدظن ہو جاؤ اور میری سماجی زندگی بھی اس سے متاثر ہو!"

"کیا وہ کوئی ایسی ہی خاص چیز ہے جو ہمارے درمیان ناچاقی کا سبب بن سکتی ہے۔"

"کم از کم ان لوگوں کا یہی خیال ہے" جوزف نے نظریں نیچی کر کے الجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا پھر روزی کو اپنی کشادہ بانہوں میں سمیٹ کر بڑی محبت سے بولا۔

"میری روح ------ میں تمہیں اپنی محبت کا یقین دلاتا ہوں۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔"

"بہر حال مجھے اصل واقعات سے تو آگاہ کرو۔" روزی کے لہجے میں بھرپور خلوص موجود تھا۔

"روزی ------ میری حسین روزی مجھے صرف ایک ہفتے کی ...... مہلت اور دے دو تاکہ میں حالات سے نپٹ سکوں اور اس کے بعد میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔" جوزف نے بڑے والہانہ انداز میں جواب دیا اور جذبات سے بے قابو ہو کر اسے بھینچ لیا ......

ایمبسڈو ہوٹل کے وسیع و عریض ڈائننگ ہال میں بیٹھے ہوئے لاتعداد ملکی اور غیر ملکی جوڑے خوش گپیوں میں مصروف تھے مشروبات کی ٹرالیاں گردش میں تھیں اور حسین و جمیل نیبل گرلز اپنے شکار کی تلاش میں میزوں کے درمیان ادھر ادھر تھرکتی پھر رہی تھیں۔ تمباکو اور شراب کی ملی جلی خوشبو نے ماحول کو کیف آگیں بنا دیا تھا۔

ہال کے مشرقی گوشے میں ایک میز پر دو مقامی امریکی باشندے بیٹھے ہوئے ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں راز و نیاز کر رہے تھے ان میں سے ایک لانبے قد اور کھڑے نقش کا مالک تھا اور دوسرا درمیانے قد کا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں پائی جانے والی چمک اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ وہ انتہائی چالاک اور عیار شخصیت کا مالک ہو گا۔

"کیا تم نے ہر طریقے سے اپنا اطمینان کر لیا ہے۔" درمیانے قد والے نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

"یس باس" دوسرے نے آہستہ سے کہا۔ "اڈگر نے آج تک کبھی کسی غلط آدمی کا انتخاب نہیں کیا۔"

"میں تمہیں چونکہ ایک معقول کمیشن دیتا ہوں اس لئے تمہارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جو قدم اٹھاؤ خوب سوچ سمجھ کر اٹھاؤ۔" درمیانے قد والے نے روکھائی سے کہا "خوب یاد رکھو کہ اگر میرے اوپر کوئی مصیبت آئی تو تم بھی الجھ جاؤ گے۔"

"اس کی فکر مت کرو چارلی۔" اڈگر نے اس بار قدرے بے تکلفی سے کہا۔

"میں صرف بزنس میں ہی نہیں بلکہ ویسے بھی تمہارا پرانا دوست ہوں۔ ایسی صورت میں بھلا میں یہ کیونکر پسند کروں گا کہ ہم دونوں میں سے کوئی مصیبت میں گرفتار ہو۔"

"تم جانو ———" راجرس نے جو اپنے دوستوں میں چارلی کے نام سے مشہور تھا لاپرواہی سے جواب دیا پھر ہونٹوں کے درمیان پھنسے ہوئے سگار کا ایک طویل کش لے کر بولا۔ "تم نے مجھے غالباً" تھرڈ فلور کا روم نمبر ڈبل ون ایٹ بتایا تھا۔"

"ہاں! ———" اڈگر تیزی سے بولا۔ "اس کا نام پرنس جگلر ہے مگر نام کے بالکل برعکس وہ انتہائی احمق اور کودن نظر آتا ہے عورتوں سے وہ یوں دور بھاگتا

ہے جیسے وہ اس کی سب سے بڑی کمزوری ہوں۔"

"ایمبسڈو میں وہ کب سے مقیم ہے۔"

"اسے یہاں آئے ہوئے چار روز گزر چکے ہیں لیکن آج تک وہ کبھی کسی عورت کے ساتھ نہیں دیکھا گیا۔" اڈگر نے شراب کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ "میں پہلے ہی روز اسے ایک موٹی مرغی سمجھ کر ایک گائڈ کی حیثیت سے اس سے تعارف حاصل کر چکا ہوں چنانچہ اب وہ پوری طرح میری مٹھی میں ہے۔"

"کیا تمہیں اس بات کا مکمل یقین ہے کہ وہ ہمارے لئے ایک اونچا شکار ثابت ہو گا۔"

"کیوں نہیں! ——— میں نے تو ان چار دنوں میں بخوبی اندازہ لگا لیا ہے کہ وہ کروڑوں کا مالک ہے اور ہاں ——— تم نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ عورتوں سے دور کیوں بھاگتا ہے جب کہ اس کی صورت شکل جنس مخالف کے لئے اپنے اندر بھرپور جاذبیت رکھتی ہے۔"

"کوئی خاص وجہ ———" راجرس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"دراصل پرنس کا باپ بہت سخت گیر طبیعت کا مالک ہے وہ نہیں چاہتا کہ اس کا اکلوتا لڑکا کسی غلط چکر میں پڑے چنانچہ اس بڈھے کھوسٹ نے پرنس کو بڑی سختی سے یہ ہدایت کی ہے کہ شادی سے قبل وہ لڑکیوں سے دور ہی رہے خلاف ورزی کی صورت میں اس نے پرنس کو کروڑوں کی جائیداد سے عاق کر دینے کی دھمکی دی ہے۔"

"بہت خوب" راجرس نے کرسی پر پہلو بدل کر پہلی بار اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔ "اگر تمہاری اطلاعات درست ہیں تو پھر پرنس یقیناً" ہمارے لئے توقعات سے بڑھ چڑھ کر ثابت ہو گا۔"

"اسی غرض سے میں تم سے کہتا ہوں کہ اب اس معاملے میں دیر مناسب نہیں۔ خدا جانے وہ احمق پرنس کب واپسی کے لئے اپنا ٹکٹ کٹا لے۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ ایسے معاملات میں واقعی دیر مناسب نہیں لیکن پھر بھی میں اپنا اطمینان کرنا چاہتا ہوں۔"

"پھر! اب پروگرام کیا ہے۔"

"کیا تم اسے کل رات کسی وقت میری دکان پر لا سکو گے۔

"میرے لئے یہ زیادہ مشکل نہ ہو گا مگر کیا تمہارا اس سے پہلے مل لینا مناسب نہ ہو گا۔"

"میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں لیکن زیادہ مناسب یہ ہو گا کہ تم اسے کل براہ راست میرے پاس لے آؤ ------ نو اور دس کے درمیان ------ لیکن ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو ------ تم مجھے اپنا دوست ظاہر کرو گے۔ پرنس کو کسی طور بھی یہ شبہ نہ ہونے پائے کہ تم اسے پروگرام کے تحت میرے پاس لائے ہو۔

"یہ سب میرے اوپر چھوڑ دو ------ میں اس ٹائپ کے احمقوں سے نپٹنا اچھی طرح جانتا ہوں۔"

کچھ دیر تک راجرس اڈگر کے ساتھ بیٹھا اپنے کل کے پروگرام کو آخری شکل دیتا رہا پھر وہ اپنے ساتھی سے مصافحہ کر کے اٹھا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا ڈائننگ ہال سے باہر نکل گیا۔



رات کے پونے دس کا وقت تھا جب گہرے نیلے رنگ کی جھلملاتی ہوئی بیوک آٹھویں شاہراہ پر ایک ایسی دکان کے سامنے پہنچ کر رکی جس پر اے ون فوٹو گرافر کا بورڈ آویزاں تھا' ڈرائیونگ سیٹ پر اڈگر موجود تھا۔ دوسرا شخص پرنس جگر تھا جو دراز قد کا ایک خوبرو جوان تھا۔ اس کی آنکھیں ہرے رنگ کی تھیں اور بال بڑے سلیقے سے جمے ہوئے تھے۔ چہرے پر پھیلے ہوئے تاثرات بتا رہے تھے کہ پرنس حد درجہ بیوقوف واقع ہوا ہے۔ گاڑی رکنے پر وہ اس طرح چونکا جیسے کچی نیند سے ہڑبڑا کر بیدار ہوا ہو۔

"کیا بات ہوئی' میرے اچھے دوست" اس نے اڈگر کو مخاطب کرتے ہوئے تعجب سے پوچھا ------ "کیا گاڑی میں کوئی نقص پیدا ہو گیا ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے میرے محترم ------" اڈگر نے بڑے مہذب لہجے میں کہا پھر بولا۔ "میں ذرا اپنے ایک دوست چارلی سے ملنا چاہتا ہوں جو اے ون فوٹو گرافرز کا مالک بھی ہے۔"

"چارلی ------" پرنس نے خوش ہو کر پوچھا۔ "کیا اس کا تعلق چارلی چپلن کے خاندان سے ہے۔"

"نہیں ------ لیکن وہ بڑا ہی خوش مزاج آدمی ہے۔"

"ہو گا ہو گا ------ اس نام کے آدمی عموماً بڑے پر مذاق ہوتے ہیں۔ لیکن ٹھہرو ------ تم نے شاید ابھی کہا تھا کہ تمہارا دوست فوٹو گرافر بھی ہے۔"

"ہاں ------ میں نے غلط نہیں کہا تھا۔

"تو کیا ------ تم اس سے میری ایک خوبصورت سی تصویر بنوا دو گے۔"

"کیوں نہیں" اڈگر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا پھر پرنس کو ساتھ لئے دکان میں چلا گیا جس کی بیرونی روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ دکان کے دو دروازوں میں سے ایک بند ہو چکا تھا جس کا مطلب یہی تھا کہ بزنس کے اوقات ختم ہو چکے ہیں۔

"ہیلو اڈگر ------ کہو کیسے آنا ہوا؟" راجرس نے جو بڑی دیر سے ان دونوں کی راہ دیکھ رہا تھا اڈگر کو دیکھ کر تیزی سے اٹھتے ہوئے بڑی گرم جوشی سے کہا ------ "اتنے دنوں سے کہا غائب تھے۔"

"اپنے مہمان کے ساتھ مصروف تھا" اڈگر نے اپنا پارٹ بڑی خوبی سے ادا کرتے ہوئے جواب دیا پھر پرنس اور راجرس کا تعارف کرانے لگا۔

"بڑی مسرت ہوئی جناب سے مل کر" راجرس نے پرنس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی آپ سے مل کر بیحد خوشی ہوئی ہے۔" پرنس نے بڑے بچکانہ انداز میں کہا پھر بولا۔ "فوٹو گرافی میری ہابی تھی لیکن ڈیڈی نے مجھے سختی سے منع کر دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ تصویریں دھونے اور چھاپنے سے انگلیوں کے ناخن سیاہ پڑ جاتے ہیں۔"

"راجرس ------" درمیان میں اڈگر بول پڑا۔ "کیا تم میرے مہمان کی ایک خوبصورت سی تصویر بنا سکتے ہو۔"

"یقیناً" ۔۔۔۔۔۔۔ یہ میری خوش قسمتی ہو گی۔" راجرس نے کہا۔ "ہر چند کہ میرا اسٹاف جا چکا ہے لیکن مجھے یہ خدمت بذات خود انجام دینے میں بڑی مسرت ہو گی۔"

پرنس کے چہرے پر بدستور حماقت برس رہی تھی۔ راجرس اسے ساتھ لے کر اپنے اسٹوڈیو میں آیا جہاں ہر چیز پہلے سے تیار تھی۔ پرنس کو ایک کرسی پر بٹھا کر راجرس نے تیز روشنیاں آن کیں پھر کیمرے کو درست کرنے لگا۔ پرنس کی نظریں جھپکے بغیر کیمرے پر مرکوز تھیں اس لئے وہ اس لڑکی کو نہ دیکھ سکا جو پشت سے ایک پردے کی آڑ سے برآمد ہوئی تھی اور جس کے جسم پر برائے نام کپڑے موجود تھے۔ میک اپ کے علاوہ چہرے کے خدوخال سے بھی وہ کوئی بدکردار لڑکی لگ رہی تھی۔ پنجوں کے بل چلتی ہوئی وہ پرنس کی عین پشت پر آکر کھڑی ہو گئی۔

راجرس اسی موقع کا منتظر تھا۔ اس نے اڈگر کو آنکھوں سے ایک مخصوص اشارہ کیا جس کو سمجھ کر اڈگر پرنس کے سامنے سے ہٹ کر اس سے پیچھے جا کھڑا ہوا اور راجرس تصویر لینے کی خاطر کیمرے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"یس پرنس ۔۔۔۔۔۔ ریڈی۔" راجرس نے پرنس کو مخاطب کر کے شٹر پر انگلی رکھی۔

ٹھیک اسی وقت نیم برہنہ لڑکی نے آگے بڑھ کر بڑے مجنونانہ انداز میں پرنس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ دوسرے ہی لمحے راجرس نے شٹر دبا دیا اور اڈگر نے بڑی خوبصورتی سے اسٹوڈیو کا مین سوئچ بند کر دیا جس سے گھپ اندھیرا پھیل گیا ۔۔۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ لمحوں میں ہو گیا۔

"اڈگر تم پرنس کا خیال رکھو ۔۔۔۔۔۔۔ میں باہر کی روشنی جلاتا ہوں۔ یہاں کا فیوز غالباً اڑ گیا ہے۔"

باہر کی بتی روشن ہوئی تو اڈگر پرنس کی پشت پر موجود تھا۔

"میری گردن میں باہیں کس نے ڈالی تھیں۔ پرنس نے باہر آ کر حماقت آمیز سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"وہ میں تھا میرے عزیز۔" اڈگر نے بڑے ادب سے جواب دیا۔ "یہ بات میرے لئے باعث فخر ہو گی کہ مجھے اس بے تکلفی سے آپ کے ساتھ تصویر اتروانے کا شرف حاصل ہوا۔ ویسے اگر آپ کو میری یہ حرکت گراں گزری ہو تو بندہ معافی کا خواستگار ہے۔"

"تم مجھ سے کہہ کر بھی میرے ساتھ بیٹھ سکتے تھے۔"

"میں دراصل نیچرل پوز چاہتا تھا۔" اڈگر مسکرا دیا۔

پرنس نے پہلے اڈگر اور پھر راجرس کو دیکھا پھر کوئی جواب دیئے بغیر دکان سے باہر آگیا۔ اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اڈگر کی بے تکلفی ناگوار گزری ہے۔

"ذرا احمق ہے ۔۔۔۔۔۔۔" اڈگر نے راجرس کو دیکھ کر آنکھ دبائی پھر مسکراتا ہوا پرنس کے پیچھے پیچھے باہر آگیا ۔۔۔۔۔۔۔!

○

پرنس اس وقت بڑے اچھے موڈ میں تھا جب راجرس نے اس کے کمرے میں قدم رکھا لیکن جس وقت راجرس نے بھورے رنگ کے لفافے سے ایک تصویر نکال کر پرنس کو دی تو پرنس اسے دیکھ کر یوں اچھل پڑا جیسے وہ تصویر اس کے لئے موت کا حکم ہو۔ اس کی پھٹی پھٹی نظریں اس تصویر پر جمی ہوئی تھیں جس میں اسے ایک نیم برہنہ عورت کے ساتھ ایکسپوز کیا گیا تھا۔ خاصی دیر تک پرنس پر سکتے کی حالت طاری رہی پھر اس نے راجرس کو دیکھ کر بڑی مردہ آواز میں کہا۔

"تم .... تم نے میرے ساتھ فراڈ کیا ہے۔"

"کیوں ۔۔۔۔۔۔ کیا یہ تصویر حضور کو پسند نہیں آئی۔" راجرس معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"مم .... میں .... اس اڈگر کے بچے کو گولی مار دوں گا۔" پرنس نے قدرے سخت لہجے میں جواب دیا۔ "یہ سب اسی حرام زادے کی شرارت ہے۔ آ لینے دو اسے۔"

"اڈگر اب آپ سے ملاقات نہیں کر سکتا میرے محترم ۔۔۔۔۔۔۔ وہ آج صبح

ہی بیروت کے لئے پرواز کر گیا ہے۔"

"بیروت ------" پرنس اپنے نچلے ہونٹ کاٹتا ہوا غصے میں بولا۔ "مجھ سے حماقت ہو گئی جو میں نے اس مردود کو اپنی کمزوری کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا ------ لیکن تم بھی اس جرم میں برابر کے شریک ہو ------ کیا سمجھے۔"

"میں بے قصور ہوں پرنس" راجرس نے اس بار سنجیدگی سے کہا۔ "اڈگر نے ایک طے شدہ پروگرام کے تحت یہ سارا ڈرامہ کھیلا تھا۔ بیروت کے لئے پرواز کرنے سے پیشتر اس نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ تصویر میں آپ کو دے کر دو لاکھ ڈالر کی رقم حاصل کر لوں ------ انکار کی صورت میں مجھے مجبوراً" اس کی ہدایت پر یہ تصویر آپ کے والد بزرگوار کی خدمت میں روانہ کر دینی پڑے گی۔"

"اچھا یہ بات ہے ------ گویا اڈگر اور تم نے مل کر مجھے بلیک میل کرنے کی سازش کی تھی۔" پرنس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

"جو لوگ وقت اور حالات سے فائدہ نہیں اٹھاتے وہ پرلے درجے کے گدھے ہوتے ہیں۔"

"ہوتے ہوں گے لیکن میں تم کو ایک کوڑی بھی نہ دوں گا ------ نکل جاؤ میرے کمرے سے۔" پرنس ایک دم غصے میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر اس نے بڑی جھلاہٹ میں تصویر کو پھاڑ کر ریزہ ریزہ کر ڈالا۔

"ایک بار پھر ٹھنڈے دل سے حالات پر غور کر لو پرنس ------ مطلوبہ رقم نہ دے کر تم کروڑوں کی جائیداد سے محروم ہو سکتے ہو۔" راجرس نے اٹھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا پھر وہ دروازے کی جانب بڑھا ہی تھا کہ پرنس نے بڑی بے بسی سے اسے آواز دی۔

"ٹھہرو ------"

راجرس بڑے اسٹائل سے رکا پھر گھوم کر پرنس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

"کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ مطلوبہ رقم مل جانے کے بعد تصویر کے نیگیٹو مجھے دے دو گے" پرنس ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔

"بزنس کے معاملات میں بدعہدی میرے اصول کے خلاف ہے اس لئے تم مجھ پ

بھروسا کر سکتے ہو۔"

"اچھا ------ تو لاؤ نکالو نیگیٹو ------ میں تمہیں دو لاکھ ڈالر کا چیک دیئے دیتا ہوں۔" پرنس کے لہجے سے بے بسی اور جھنجلاہٹ مترشح تھی۔

"میں اتنا احمق بھی نہیں ہوں جو نیگیٹو ساتھ لاتا اور تم مجھے پھنسوا کر اپنا الو سیدھا کر لیتے۔" راجرس بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "ہاں ------ ایک اچھے کاروباری کی حیثیت سے میں وعدہ کرتا ہوں کہ رقم وصول ہوتے ہی میں تم کو نیگیٹو دے دوں گا۔"

"اور اگر بعد میں تم وعدے سے منحرف ہو گئے؟"

"بھروسا تو تمہیں بہرحال کرنا ہو گا پرنس۔"

پرنس نے غصیلی نظروں سے راجرس کو دیکھا پھر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی جھلاہٹ اور سنجیدگی بڑی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ چند لمحے کمرے میں مکمل سکوت طاری رہا پھر پرنس نے راجرس کو مخاطب کر کے کہا۔

"کیا تم کل کسی وقت آ کر چیک لے لو گے۔"

"سوری پرنس" راجرس مسکرایا۔ "میں آج کا کام کل پر چھوڑنے کا عادی نہیں ہوں۔"

پرنس ایک بار پھر تلملا کر رہ گیا۔ کچھ دیر تک وہ خاموش کھڑا اپنا نچلا ہونٹ چباتا رہا پھر اس نے آبنوسی لکڑی کی بنی ہوئی میز سے اپنی چیک بک نکالی اور بیٹھ کر رقم بھرنے لگا۔ راجرس کچھ فاصلے پر اس کی پشت پر کھڑا تھا۔ چیک بھرنے کے بعد پرنس نفرت سے ہونٹ سکیڑے راجرس کے قریب آیا اور چیک اسے دیتے ہوئے بولا۔

"میں تم پر اعتماد کرنے کے لئے مجبور ہوں لیکن مجھے توقع ہے کہ تم براہ مہربانی کل مجھے اس تصویر کا نیگیٹو واپس کر دو گے۔"

"یقیناً" ایسا ہی ہو گا اچھے پرنس۔" راجرس نے چیک پر ایک نظر ڈال کر اسے جیب میں رکھا پھر معنی خیز انداز میں مسکراتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا ------!

دیوار گیر کلاک نے اس وقت رات کے آٹھ بجنے کا اعلان کیا تھا!

○

ٹوکن ہاتھ میں لئے راجرس بڑی بے چینی سے ٹہل رہا تھا بار بار وہ کھڑکی پر جا کر کاؤنٹر کلرک سے چیک کی بابت پوچھتا تھا اور پھر ٹوکن کو ہاتھ میں دبائے واپس لوٹ آتا تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ چوتھی بار کھڑکی پر گیا تو کلرک نے اسے بڑے مہذب لہجے میں مخاطب کیا۔

"ٹوکن نمبر ڈبلیو نائن آپ ہی کے پاس ہے۔"

"ہاں ——— کیا چیک آگیا۔"

"جی نہیں ——— آپ کو مطلوبہ رقم کی ادائیگی براہ راست مینیجر کرے گا۔ آپ اندر تشریف لے جائیں۔"

"شکریہ ———" راجرس نے مختصراً کہا پھر قدم بڑھاتا مینیجر کے کمرے کی جانب چل دیا۔ ایک منٹ بعد ہی وہ مینیجر کے سامنے بیٹھا تھا۔

"آپ نے ٹوکن ڈبلیو نائن کے سلسلے میں مجھے اندر بلایا ہے۔"

"جی ہاں ———" مینیجر نے راجرس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے قدرے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ "میں آپ کو ادائیگی کر دوں گا لیکن اس کے لئے آپ کو تھوڑی دیر اور انتظار کرنا پڑے گا۔"

"کوئی خاص بات ہے" راجرس نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں ——— آپ نے جو چیک پیش کیا ہے اس کے سلسلے میں کچھ ضروری تفتیش کرنی لازمی ہے۔"

"کیا مطلب" راجرس کے چہرے کی رنگت بدلنے لگی۔

"مجھے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے جناب کہ چار روز قبل مجھے اس چیک کی گمشدگی کی اطلاع اکاؤنٹ ہولڈر کی طرف سے مل چکی ہے۔ ایسی صورت میں تفتیش کئے بغیر رقم کی ادائیگی میرے لئے مشکل ہے' ویسے آپ مطمئن رہیں مسٹر ٹمپلر کو فون کیا جا چکا ہے وہ بس پہنچنے ہی والے ہوں گے۔"

"ٹمپلر ———" راجرس نے حیرت سے مینیجر کو دیکھا۔

"جی ہاں ——— میری مراد مسٹر سائمن ٹمپلر سے ہے۔"

"لل .... لیکن ———" راجرس سائمن ٹمپلر کا نام سن کر بری طرح

بوکھلا گیا اور ہکلاتے ہوئے بولا ——— "یہ چیک تو مجھے پرنس جگر نے دیا تھا جو ان دنوں ایمبسڈر ہوٹل میں مقیم ہیں۔"

"ممکن ہے آپ درست فرما رہے ہوں مگر ———"

"پھر قبل اس کے کہ مینیجر اپنا جملہ مکمل کرتا سائمن ٹمپلر مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ مینیجر نے اٹھ کر اسے خوش آمدید کہا پھر وہ چیک اس کی جانب بڑھا دیا جو کچھ دیر پیشتر راجرس نے باہر پیش کیا تھا۔

"کیا رقم کی ادائیگی کر دی گئی ہے۔" ٹمپلر نے تیزی سے پوچھا۔

"جی نہیں ———" مینیجر نے کہا پھر راجرس کی طرف اشارہ کر کے بولا ——— "یہ وہ صاحب ہیں جنھوں نے چیک کیش کرانے کی کوشش کی تھی۔"

"بہت خوب ———" ٹمپلر نے راجرس کو دیکھا جس کے نام کے دستخط وہ چیک کی پشت پر دیکھ چکا تھا۔ "تم نے میرے دستخط بنانے کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ تمہیں اس جرم کی پاداش میں ایک لمبی سزا بھگتنی پڑے گی۔

"کیا میں پولیس کو اس معاملے کی اطلاع دے دوں مسٹر ٹمپلر۔" مینیجر نے دریافت کیا۔

"آپ زحمت نہ کریں ——— میں مسٹر راجرس کو تھوڑا بہت ذاتی طور پر بھی جانتا ہوں۔ مجھے توقع ہے کہ یہ میرے ساتھ کوئی نہ کوئی سمجھوتا ضرور کر لیں گے۔ دوسری صورت میں آپ کی گواہی یقیناً میرے لئے بہت کار آمد ثابت ہو گی۔" ٹمپلر کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"مگر میں نہیں سمجھ سکا کہ آخر یہ سب کیا چکر ہے۔" راجرس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"جو لوگ وقت اور حالات سے فائدہ نہیں اٹھاتے وہ پرلے درجے کے گدھے ہوتے ہیں۔" ٹمپلر نے معنی خیز لہجے میں راجرس کو مخاطب کیا پھر بولا۔ "کیا تم ایک اچھے کاروباری آدمی ہونے کی حیثیت سے میرے ساتھ باہر چل کر گفتگو نہیں کرو گے۔"

راجرس نے ٹمپلر کی ہرے رنگ کی شربتی آنکھوں کی جانب غور سے دیکھا پھر سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور رنگت زرد پڑتی جا رہی تھی پھر جب ٹمپلر نے اس کا بازو تھام کر اٹھایا تو وہ سر جھکائے چپ چاپ اٹھا اور اس کے ساتھ باہر آگیا ———!

○

چائے کی میز پر جب ٹمپلر کی موجودگی میں جوزف نے روزی کو حالات سے آگاہ کیا تو وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔

"کیا یہ سب کچھ صحیح ہے مسٹر ٹمپلر" روزی نے قہقہے .... بکھیرتے ہوئے پوچھا۔

"پتا نہیں ———" ٹمپلر نے بڑی معصومیت سے شانے اچکائے پھر میز پر رکھی پلیٹوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

کچھ دیر بعد جب وہ ہنستے بولتے ڈرائنگ روم میں آئے تو جوزف نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"ٹمپلر ——— میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے ایک بڑی مصیبت سے بچا لیا۔ اگر تم نے راجرس کو ایک مناسب سبق نہ دیا ہوتا تو میں تباہ ہو جاتا۔"

"اس بات کو بھول جاؤ میرے دوست" ٹمپلر نے کہا۔ "میں نے جو کچھ کیا وہ میرا فرض تھا۔"

"لیکن میں جانتا ہوں کہ میرے سلسلے میں تمہیں اپنی جیب سے ایک اچھی خاصی رقم خرچ کرنی پڑی ہے۔ کیا تم مجھے اجازت دو گے کہ میں تمہارے اخراجات تمہیں ادا کر دوں۔"

"میں خسارے کا سودا کرنے کا عادی نہیں ہوں میرے اچھے دوست تمہارے سلسلے میں میری جیب سے جو کچھ خرچ ہوا ہے اس سے کہیں زیادہ میں راجرس سے وصول کر چکا ہوں ——— اچھا خدا حافظ ———اور ہاں یہ لفافہ سنبھال کر رکھ لو اس میں تمہارے وہ نیگیٹو موجود ہیں جن کے سلسلے میں تم بہت پریشان تھے۔"

ٹمپلر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ٹمپلر کے جانے کے بعد جوزف نے روزی کو پیار بھری نظروں سے دیکھا پھر آگے بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

○

پھانس

مولوی عبدل متین کا تعلق یوں تو رام پور سے تھا لیکن جب ہندوستان کے بٹوارے کے سلسلے میں تعصب اور فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑکی تو وہ بھی اپنی بیوی اور چار بچوں سمیت پاکستان آ گئے۔ مال و اسباب راستے ہی میں ان لٹیروں کے ہاتھ چھن گیا تھا جنہیں حکومت وقت کی جانب سے مسلمانوں کے ساتھ ننگا فساد اور قتل و غارت گری کرنے کی کھلی چھٹی ملی ہوئی تھی۔ مولوی عبدل متین نے بے سرو سامانی کی حالت میں ایک نئی سر زمین پر قدم رکھا تو سب سے پہلے دو رکعت شکرانے کی نماز ادا کی۔ انہیں مال و اسباب لٹ جانے کے مقابلے میں اس بات کی زیادہ خوشی تھی کہ ان کی بیوی بچوں کی جان بچ گئی تھی ورنہ انہوں نے بلوائیوں کو نوجوان لڑکیوں اور بوڑھے مردوں کے ساتھ ایسا بہیمانہ اور نازیبا سلوک کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ آج بھی جب وہ روح فرسا مناظران کے ذہن کے پردے پر ابھرتے تھے تو وہ سرتا پا کانپ اٹھتے تھے۔ ان کی گردن شرم سے جھک جاتی تھی۔

پاکستان میں داخل ہونے کے بعد انہوں نے راولپنڈی کے قریب ایک نواحی بستی کو جس کا نام اس وقت رام نگر تھا اپنا مسکن بنا لیا۔ رام نگر سو سوا سو گھروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ وہاں کے لوگ سیدھے سادے اور بھلے مانس تھے اس لیے انہوں نے مولوی عبدل متین کی میزبانی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ وہ چونکہ تہجد گزار اور صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے اس لئے بستی کے لوگوں نے مل جل کر وہاں ایک چھوٹی سے مسجد تعمیر کی اور مولوی عبدل متین کو اس کا پیش امام مقرر کر دیا۔ مسجد کے برابر ہی ایک کمرے کا مکان بٹوارے کے بعد سے خالی پڑا تھا۔ بستی کے لوگوں نے اسے بھی ٹھیک ٹھاک کر کے ان کے حوالے کر دیا اور حسب استطاعت ان کی اتنی ماہانہ تنخواہ مقرر کر دی کہ گزر بسر

آسانی سے ہو سکے۔

مولوی عبدل متین نے جو اپنے نام کی مناسبت سے نہایت سنجیدہ، بردبار واقع ہوئے تھے بہت جلد بستی والوں کے دلوں میں اپنی شرافت اور دیانت داری کا ایسا سکہ جمایا کہ ہر شخص ان کا گرویدہ ہو گیا۔ وہ مسجد میں پانچوں وقت کی باقاعدگی سے نماز بھی پڑھتے تھے اور فالتو وقت میں بستی کے نوجوان، چھوٹے بڑے، بچے اور بوڑھوں کو اسلامی تعلیمات کا درس بھی دیا کرتے۔ آہستہ آہستہ وہ پوری بستی کے سب سے معتبر شخص بن گئے پھر بستی والوں نے اپنی لڑکیوں کو بھی تعلیم حاصل کرنے کی خاطر بھیجنا شروع کر دیا۔ مولوی عبدل متین چونکہ شرعی معاملات میں بہت سخت اور ٹھوس اصولوں کے مالک تھے اس لیے لڑکیوں کے معاملے میں ان کی پہلی شرط یہ تھی کہ وہ اپنے چہرے اور جسم کو اس طرح ڈھانپ کر آئیں کہ سوائے آنکھ اور کلائی کے جسم کا کوئی اور حصہ نظر نہ آئے۔

مولوی عبدل متین کے علاوہ ان کی بیوی صغریٰ بیگم نے بھی بہت جلد بستی کی عورتوں کے درمیان ایک خاص مقام پیدا کر لیا تھا۔ گاؤں کا ہر فرد ان دونوں میاں بیوی کا مداح بن کر رہ گیا تھا لیکن جہاں گل ہوتے ہیں وہاں خار بھی ضرور ہوتے ہیں۔ جہاں بستی کی اکثریت نے ان کا، اور ان کی بیوی صغریٰ بیگم کے نام کا کلمہ پڑھنا شروع کر دیا تھا وہاں نوجوان نسل سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کی ایک ٹولی ایسی بھی تھی جو خاص طور پر مولوی عبدل متین سے خار کھاتی تھی۔ ان میں سر فہرست نام حجام کرامت علی کے بیس سالہ شبیر کا تھا جسے اس کے یار دوست شیرا کے نام سے پکارتے تھے۔ شیرا کی بات رمضو قصائی کی نوجوان لڑکی کلثوم سے طے پا چکی تھی۔ کلثوم بستی کی سب سے زیادہ حسین شوخ و چنچل لڑکی تھی۔ کسی سرکش گھوڑی کی طرح منہ زور بھی تھی۔ بستی کی کھلی فضا اور خالص دودھ، دہی، گھی اور مکھن نے اس کی جسمانی نشوونما کو وقت کی رفتار کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی اجاگر کر دیا تھا اس لیے جب ایک روز شیرا کو اس بات کا علم ہوا کہ رمضو نے کلثوم کو بھی مسجد میں پڑھنے کے لیے بٹھا دیا ہے تو اس کے اندر نہ جانے کیوں رقابت کا احساس تڑپ کر بیدار ہو گیا۔

مولوی عبدل متین کی عمر اڑتیس اور چالیس کے پیٹے میں تھی۔ جسمانی اعتبار سے وہ خاصے ٹھوس اور مضبوط قوی کے مالک تھے۔ مونچھ اور داڑھی کے بال گہرے سیاہ اور چمکیلے

تھے۔ پیشانی پر کثرت عبادت سے محراب کا بڑا نشان بھی موجود تھا جو ان کی شرافت کی دلیل تھا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود شیرا کو یہ بات منظور نہیں تھی کہ کم از کم کلثوم ان سے پڑھنے جائے۔ کلثوم اور شیرا ایک ساتھ ہی پلے بڑھے تھے۔ بچپن میں ساتھ کھیلے کودے تھے اس لیے ایک دوسرے سے خاصے بے تکلف بھی تھے البتہ جب سے ان دونوں کے رشتے کی بات پکی ہوئی تھی شیرا نے محسوس کیا تھا کہ وہ اس کے قریب آنے سے کترانے لگی ہے جس کی وجہ اس کے ذہن میں یہی آئی تھی کہ شاید چاچا رمضو نے کلثوم پر شیرا کے ساتھ زیادہ گھل مل کر اٹھنے بیٹھنے پر پابندی لگا دی ہو۔ بہر حال ایک دن شیرا نے موقع پا کر اس کا راستہ روک لیا۔

"کیا بات ہے کلثوم۔ جب سے ہماری بات پکی ہوئی ہے تو مجھ سے کنی کترانے لگی ہے۔ لڑکیوں کے ساتھ تو دن بھر ہرنیوں کی طرح بڑی کلیلیں مارتی پھرتی ہے۔ میرے اندر اب کیا کانٹے نکل آئے ہیں۔"

"تیری کھوپڑی میں تو بھس بھر گیا ہے۔" کلثوم نے بڑی بے باکی سے جواب دیا۔ "اتنی سی بات بھی تیری کھوپڑی میں نہیں آتی کہ بات پکی ہو جانے کے بعد لڑکے اور لڑکی کے درمیان حجاب آ جاتا ہے۔" پھر وہ معنی خیز انداز میں دیدے نچاتے ہوئے بولی۔ "آگ اور پٹرول کا ساتھ اچھا نہیں ہوتا۔ ایک چنگاری بھی سب کچھ بھسم کر دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔"

"اب تو تجھے بڑی بڑی باتیں کرنا آ گئی ہیں۔" شیرا نے اس کے سیب جیسے گدرائے ہوئے گالوں کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ "یہ آگ اور پٹرول والی بات تجھے کس نے بتائی ہے۔"

"کسی نے بھی بتائی۔ تجھے اچانک کھوج کیوں لگ گئی۔" کلثوم نے شیرا کو جلانے کی خاطر شوخی سے کہا۔ "چل ہٹ میرے راستے سے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا اور بابا کے کانوں تک بھنک پہنچ گئی تو وہ مجھے دھن کر رکھ دے گا۔"

"کیا تیرے بابا نے اب ہمارے بات کرنے پر بھی کرفیو لگا دیا ہے۔" شیرا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"مجھ سے کیوں معلوم کر رہا ہے اگر پوچھنا ہے تو جا کر خود بابا سے معلوم کر لے۔"

کلثوم نے شرارتی لہجے میں کہا۔ "وہ ہاتھ میں بغدا لے کر تجھے الف سے لے کر بڑی یے تک سب کچھ بڑی تفصیل سے سمجھا دے گا۔"

"کلثوم .... مجھے تجھ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" شیرا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"جلدی بول .... کیا کہنا ہے؟"

"پہلے وعدہ کر کہ تو میری بات سے انکار نہیں کرے گی۔"

"کیا مطلب ....؟" کلثوم دریا کی کسی سرکش موج کی طرح کنارے سے ٹکرا کر چھلک اٹھی۔ "ارادے تو نیک ہیں تیرے۔"

"بات مذاق میں مت ٹال۔"

"پھر کھل کر بات کیوں نہیں کرتا۔ عورتوں کی طرح سے پہیلیاں کیوں بوجھ رہا ہے۔"

"وہ بات دراصل یہ ہے کلثوم کہ ...." شیرا پھر کچھ کہتے کہتے رک گیا تو کلثوم شانے اچکاتے ہوئے بولی۔

"ایک کام کر .... آج تو اچھی طرح یاد کر لے کہ تجھے کیا کہنا ہے دوبارہ ملاقات ہوئی تو میں خود پوچھ لوں گی۔"

"میں نے سنا ہے کہ اب تو بھی پڑھنے کے لیے مولوی صاحب کے پاس جانے لگی ہے۔" شیرا ہمت کر کے دل کی بات زبان تک لے آیا۔

"ہاں .... کیوں؟" کلثوم نے تعجب سے پوچھا۔

"مجھے یہ اچھا نہیں لگتا' میری بات مان تو کل سے یہ پڑھنا لکھنا بند کر دے۔"

"مگر کیوں ....؟" کلثوم بڑی حیرت سے بولی۔ "آمنہ' نازو' زرینہ' بتول' سکینہ اور زیتون سب ہی جاتی ہیں پڑھنے کے لیے پھر تو مجھے کیوں منع کر رہا ہے۔"

"اس لیے کہ تو اب میری ہو چکی ہے۔ دوسری لڑکیاں کیا کرتی ہیں مجھے اس سے کیا لینا۔"

"اب سمجھی ...." کلثوم نے شیرا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "تو ابھی سے میرے اوپر رعب جھاڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک بات کان کھول کر سن لے۔ میں تیری بھبکی میں کبھی نہیں آؤں گی۔"

"تو میرا مطلب غلط سمجھ رہی ہے کلثوم! میں تجھ پر رعب جمانے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں۔" شیرا نے صفائی پیش کی۔

"پھر...... تجھے میرا مولوی صاحب سے پڑھنا برا کیوں لگتا ہے۔ کیوں روک رہا ہے مجھے وہاں جانے سے ......" کلثوم نے جرح کی۔

"تو نہیں سمجھتی کلثوم۔ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ ......"

"چل چھوڑ میرا راستہ۔" کلثوم بپھر کر بولی۔ "میں سب سمجھتی ہوں۔ تیرے دماغ میں یہ بات رحمتے نے بٹھائی ہو گی۔ اسی کی گندی کھوپڑی میں ہر وقت باؤلی ہنڈیا پکتی رہتی ہے۔ باپ دن بھر دوسروں کے جوتے گانٹھتا رہتا ہے اور وہ لڑکیوں سے پیچ لڑانے کے چکر میں سارا دن کٹی ہوئی پتنگ کی طرح آگے پیچھے ڈولتا پھرتا ہے ...... ذات کا چمار جو ٹھہرا۔ جس دن میرے ہتھے چڑھ گیا دم پر ایسا پاؤں رکھوں گی کہ ساری بستی میں چیں چیں کرتا پھرے گا۔ کمینہ کہیں کا' جیسا خود ہے ویسا ہی دوسروں کو بھی سمجھتا ہے اور تو نے اس جیسے بد ذات سے دوستی گانٹھ رکھی ہے۔ جس دن میں نے بابا سے اس کی شکایت کر دی اور اسی دن وہ اس کی ہڈی بوٹی الگ الگ کر کے رکھ دے گا۔ جا کر کہہ دینا اپنے لنگوٹیا سے۔"

پھر شیرا اس کی شکل ہی دیکھتا رہ گیا اور کلثوم منہ پھیر کر بڑے غصے میں لمبے لمبے قدم اٹھاتی چلی گئی۔

○

مولوی عبدل متین شریف اور ایماندار ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے ٹھوس اصولوں کے مالک تھے۔ یوں تو بستی کے سارے چھوٹے بڑوں سے ان کی علیک سلیک تھی لیکن راولپنڈی کی ایک قریبی پولیس چوکی کے ہیڈ محرر غلام رسول سے ان کی زیادہ دوستی تھی۔ غلام رسول کے پاس ذاتی موٹر سائیکل تھی اس لیے وہ روز اسی پر آتا جاتا تھا۔ وہ پولیس میں ہونے کے باوجود پانچوں وقت کا نمازی تھا۔ اس کا مکان بھی مسجد کے قریب ہی تھا اس لیے فاضل اوقات میں اس کا اور مولوی عبدل متین کا وقت ایک ساتھ ہی گزرتا تھا۔ آج بھی عصر کی نماز کے بعد وہ دونوں بیٹھے گفتگو میں مصروف تھے۔ غلام رسول حسب عادت پولیس چوکی میں درج کرائی جانے والی ایف' آئی' آر کی روداد سنا رہا تھا۔

"اب تو زمانہ اتنی تیزی سے ترقی کر رہا ہے کہ نئی نسل کے لڑکے لڑکیوں کو شرافت تو درکنار باپ دادا کی عزت اور وقار کا بھی کوئی خیال نہیں۔ جس کو دیکھئے جدھر من چاہے منہ اٹھائے بھاگا چلا جا رہا ہے۔ قتل و غارت گری کے واقعات تو آئے دن ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن آج کل اغوا یا جبر اور لڑکے لڑکیوں کے گھر سے فرار ہو جانے کی وارداتیں زیادہ ہونے لگی ہیں۔ ماں باپ ہزاروں جتن کر کے اپنے بچوں کو پال پوس کر جوان کرتے ہیں۔ اپنی راتوں کی نیندیں حرام کر دیتے ہیں۔ اپنی حیثیت کے مطابق ان کا ہر طرح سے خیال بھی رکھتے ہیں لیکن جہاں لڑکے اور لڑکیاں اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئے اور بڑی بڑی درس گاہوں میں قدم رکھا تو پھر ان کی آنکھیں معاشرے اور نئی تہذیب کو دیکھ کر چندھیا جاتی ہیں۔" غلام رسول نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "آج کل بین الاقوامی پیمانے پر بڑے بڑے دانشور اور عالم فاضل فضائی آلودگی اور اس کے مضر رساں اثرات کے بارے میں لمبی چوڑی تقریریں کرتے ہیں۔ اخباروں میں بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ ان کے بیانات چھپتے ہیں۔ ان کی قابلیت کی واہ واہ بھی ہوتی لیکن کسی کو معاشرے اور ماحولیاتی آلودگی کے متعلق کوئی خیال نہیں آتا۔ جدید فیشن کے بے ہودہ تقاضے کس طرح ہماری تہذیب اور انسانی قدروں کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں اس کی فکر کسی کو نہیں۔ تعلیمی اداروں اور درس گاہوں میں کیا کچھ ہو رہا ہے اس کی خبریں بھی اخبارات میں چھپتی ہیں۔ لیکن ہمارے نظام کے با اثر اجارہ داروں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔"

تعلیمی اداروں اور درس گاہوں کے حوالے پر مولوی متین ایک لمحے کے لیے چونکے پھر آہستہ سے بولے۔ "کیا آج پھر کوئی انوکھی واردات کی رپورٹ درج کرائی گئی ہے۔"

"بس کیا عرض کروں مولوی صاحب۔" غلام رسول نے پہلو بدل کر کہا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے جدید فیشن اور شرم و حیا کا یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔"

"کوئی خاص حادثہ ہو گیا کیا؟"

"حادثے کی بات اور ہوتی ہے۔ گاڑی کا ایک پرزہ ٹوٹ جائے تو اس کی جگہ بازار سے نیا خرید کر لگا دیتے ہیں لیکن کچھ کل پرزے ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک بار ٹوٹ جائیں تو پھر ان کا کوئی بدل نہیں ہوتا ...... گاڑی ٹھپ ہو کر رہ جاتی ہے۔"

"قصہ کیا ہے ......؟" مولوی عبدل متین نے تجسس سے پوچھا۔

"ادھر شہر میں ایک مشہور بیرسٹر شوکت مرزا رہتا ہے۔ بڑا اونچا نام ہے اس کا۔ جس کی طرف سے وکالت نامہ داخل کر دے بس سمجھیں کہ جیت اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ ایک ایک کیس کے پچاس ساٹھ ہزار لیتا ہے۔" غلام رسول نے کہا۔ "للو پنجو قسم کے چھوٹے موٹے لوگوں کو تو اس کا چپڑاسی ہی دروازے سے دھتکار کر بھگا دیتا ہے لیکن آج اس کی ساری بیرسٹری اور قانون کی موٹی موٹی کتابیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔"

"کیوں ......؟"

"اس کی ایک بیٹی تھی زیبا جو اپنے ہی محلے کے ایک لڑکے امجد کے ساتھ فرار ہو گئی۔" غلام رسول نے سنجیدگی سے کہا۔ "امجد کا باپ ایک پرائمری اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہے۔ عابد حسین نام ہے اس کا۔ تھانیدار نے اسے بلوایا تو غریب بیٹے کے کرتوت سن کر کسی تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح منہ سے جھاگ اڑانے لگا۔ اس نے لاکھوں قسمیں کھا ڈالیں کہ اسے حالات کا کوئی علم نہیں ہے لیکن تھانیدار نے دھکے مار مار کر جیل میں ٹھونس دیا۔ دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا بیچارہ لیکن اس کی دہائی اب بھلا کون سنے گا۔"

"لیکن امجد نے جو اقدام اٹھایا ہے اس میں بھلا اس کے باپ کا کیا قصور ہے۔"

"آپ نے بھی بھلی کہی مولوی صاحب۔" غلام رسول نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "بھلا بیرسٹر شوکت مرزا کے آگے اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی کون سنے گا۔ بڑے کانٹے کا وکیل ہے۔ اتنی دور دور کی کوڑیاں لاتا ہے کہ مجسٹریٹ اور جج بھی اس کا منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ عابد حسین کیا بیچتا ہے اس کے آگے ...... ایک بات تو طے ہے ...... شوکت مرزا قانون کے شکنجوں میں جکڑ کر عابد حسین کو ایسا دھوبی پٹڑا دے گا کہ اس غریب کی کمر تمام زندگی سیدھی نہیں ہو سکے گی ...... اس کی سات پشتیں بھی پناہ مانگیں گی بیرسٹر سے ...... ہو سکتا ہے کہ اس کی عمر جیل میں چکی پیستے پیستے ہی اس کے ساتھ دغا کر جائے لیکن اس کے ساتھ ہی ایک بات اور بھی طے ہے۔ اگر بیرسٹر کی لڑکی کی عزت لٹ گئی تو قانون کی بھلا کون سی دفعہ اس کی لٹی ہوئی عزت کو بحال کر سکے گی؟ بدنامی جو ہو چکی ہے اس کا نعم البدل کیا ہو گا۔ شیشہ اگر ایک بار ٹوٹ جائے تو جڑنے کے بعد بھی اس کا عیب

نہیں جاتا۔"

"تم نے ٹھیک کہا غلام رسول ......" مولوی عبدل متین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "انسانیت کی حدود جہاں ختم ہو جاتی ہیں وہیں سے بے شرمی اور بے حیائی جنم لیتی ہے۔"

"تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔" غلام رسول بولا۔ "بیرسٹر کی لڑکی بھی اس کیس میں برابر کی شریک ہو گی۔ میں تو کہتا ہوں اسلام کی رو سے ان دونوں ہی کو سنگسار کر دینا چاہیے۔ پودے کو جڑ سے نہ اکھاڑا جائے تو وہ کچھ عرصے بعد دوبارہ دھرتی کا سینہ چیر کر اوپر آنے کو زور کرنے لگتا ہے۔"

مولوی عبدل متین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کسی سوچ میں گم رہے۔ غلام رسول بڑی دیر تک اپنے دل کی بھڑاس نکالتا رہا پھر موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

"مولوی صاحب! میں نے سنا ہے کہ آپ نے لڑکیوں کو تعلیم دینے کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔"

"آں ...... ہاں۔" مولوی عبدل متین نے چونکتے ہوئے کہا۔

"کوئی خاص وجہ ......؟" غلام رسول نے بڑی رازداری سے پوچھا۔

"عزت کا کوئی مول نہیں ہوتا غلام رسول۔ کبھی کبھی برسوں کا قائم بھرم ایک پل میں ٹوٹ کر چکنا چور ہو جاتا ہے۔ میں نے یہ سوچ کر ہی لڑکیوں کی پڑھائی کا سلسلہ بند کیا ہے۔" مولوی عبدل متین نے دبی زبان میں کہا۔ "بستی والوں نے مجھے جو عزت دی ہے میں چاہتا ہوں اس کا بھرم ہمیشہ قائم رہے۔"

"میں دس گیارہ سال سے پولیس کے محکمے میں بھاڑ نہیں جھونک رہا ہوں۔" غلام رسول نے دبی زبان میں کہا۔ "ترقی نہ کر سکا اس کی وجہ کچھ اور ہے لیکن اتنا تجربہ ضرور رکھتا ہوں کہ اچھے اور برے کی پہچان کر سکوں۔ یہ آپ کی بڑائی اور شرافت ہے کہ آپ کسی عیب پوشی کی خاطر زبان سے کچھ نہ کہیں لیکن کوئی نہ کوئی ایسی خاص وجہ ضرور ہو گی جو آپ نے لڑکیوں کی پڑھائی کا سلسلہ بند کر دیا۔ میں بھی اسی بستی میں رہتا ہوں مولوی صاحب۔ ایک ایک کی نس نس سے واقف ہوں۔"

مولوی عبدل متین بڑی خوبصورتی سے بات کو طرح دے گئے لیکن اسی رات جب وہ سونے کے ارادے سے لیٹے تو کلثوم کا تصور پھر ان کی نگاہوں کے سامنے ابھر آیا جس کی

وجہ سے انہوں نے لڑکیوں کو پڑھانے کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔

اس روز کلثوم وقت سے کچھ پہلے ہی پڑھنے آ گئی تھی مولوی عبدل متین نے اس سے جلدی آنے کا سبب اور دوسری لڑکیوں کے سلسلے میں استفسار کیا تو کلثوم نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"مجھے دراصل آپ سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔"

"کیا ......؟"

"وہ جو شیرا ہے نا مولوی صاحب۔ حجام کرامت علی کا بیٹا' اس کے ساتھ میری بات" کلثوم اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی۔ حیا کی سرخی اس کے چہرے پر پھیلی تو وہ تپ کر اور گلنار ہو گئی۔

"سمجھ گیا ......" مولوی عبدل متین نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "رمضو نے مجھے بتایا تھا اس سلسلے میں' لیکن تجھے کیا ضروری بات کرنی ہے؟ کیا شیرا تجھے پسند نہیں ہے؟"

"شیرا میں تو کوئی برائی نہیں ہے مولوی صاحب لیکن مجھے رحمتے کے ساتھ اس کا میل جول پسند نہیں۔" کلثوم نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ "وہ روزانہ کچھ نہ کچھ الٹی سیدھی پٹی پڑھاتا رہتا ہے شیرا کو اور وہ مٹی کا مادھو اس کی باتوں میں آ جاتا ہے۔"

"میں کسی وقت سمجھا دوں گا شیرا کو ......"

"نہیں ......" کلثوم تیزی سے بولی۔ "آپ ایسا غضب بھی نہ کیجئے گا ورنہ شیرا اور بھڑک اٹھے گا۔"

"وہ کیوں ......؟"

"رحمتے نے آپ ہی کے خلاف تو اسے بھڑکایا ہے۔" کلثوم روانی میں کہتی چلی گئی۔ "اسی بس کی گانٹھ نے آپ کے بارے میں شیرا کے کان بھر دیے ہیں۔"

"کیا مطلب ......؟" مولوی عبدل متین کے کان کھڑے ہو گئے۔

"شیرا کہتا ہے کہ میں آپ سے پڑھنے نہ آیا کروں۔"

"کوئی وجہ ......؟"

"اس کا خیال ہے کہ اب میں بڑی ہو گئی ہوں اور آپ ......" کلثوم نے اس بار مولوی عبدل متین کی شرافت اور پاکبازی کو ٹٹولنے کی خاطر ہونٹوں پر ایک معنی خیز

مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا تو مولوی عبدل متین کے پیروں تلے زمین سرک گئی۔ کلثوم کی بات بازگشت بن کر ان کے کانوں میں گونجتی رہی۔ وہ خطرے کی پہلی گھنٹی تھی جسے سن کر وہ کانپ اٹھے تھے۔

"بتایئے نا! مولوی صاحب ......" کلثوم نے مولوی عبدل متین کو ایک بار پھر کسوٹی پر گھس کر کھوٹے اور کھرے کی پہچان کرنے کی خاطر بڑی ادا سے پوچھا۔ "شیرا کیوں منع کرتا ہے مجھے آپ کے پاس آنے سے۔"

"کلثوم ......" مولوی عبدل متین نے اپنے بے داغ کردار پر آگ کی پہلی لپیٹ محسوس کی تو اچانک فیصلہ کن لہجے میں بولے۔ "کل سے تو یہاں پڑھنے نہ آنا اور دوسری لڑکیوں کو بھی منع کر دینا۔"

"لیکن مولوی صاحب! شیرا بکتا ہے تو بکنے دیجئے اسے میں نے تو آپ کو کچھ نہیں کہا۔" کلثوم یک لخت سنجیدہ ہو گئی۔

"بات شیرا یا رحمتے کی نہیں۔ وقت کی ہے۔" مولوی عبدل متین نے ٹھوس اور روکھے لہجے میں جواب دیا۔

"میرے پاس اب اتنا وقت نہیں ہے کہ لڑکیوں کے تعلیمی سلسلے کو جاری رکھ سکوں۔"

پھر اس سے پہلے کہ کلثوم مزید کوئی بات کرتی مولوی عبدل متین تیزی سے اٹھ کر اپنے مکان میں چلے گئے۔ اس دن کے بعد سے انہوں نے لڑکیوں کو پڑھانا بند کر دیا تھا۔ بستی کے بیشتر لوگوں نے ان سے اصرار کیا کہ وہ لڑکیوں کو اسلامی تعلیم دینے کا سلسلہ بند نہ کریں لیکن وہ وقت نہ ہونے کا بہانہ کر کے اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے۔ اصل وجہ کیا تھی اس کا علم پوری بستی میں سوائے کلثوم کے کسی اور کو نہیں تھا۔ بدنامی کے ڈر سے اس نے اپنی زبان نہیں کھولی لیکن اس کے دل میں رحمتے سے نفرت کا احساس اور بڑھ گیا تھا۔ وہ کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھی جب وہ رحمتے کو لعن طعن کر کے اپنے دل کا غبار نکال سکے۔ قدرت نے اسے یہ موقع بھی فراہم کر دیا۔

رمضو تھا تو قصائی لیکن بزرگان دین کے نام پر دیگیں پکوانا اور بستی والوں کو اپنی خوشی میں شریک کرنا اس کے معمول میں داخل تھا شاید یہی وجہ تھی جو قدرت نے اس کے کاروبار میں خاصی برکت عطا کر رکھی تھی۔

اس روز کلثوم گیارہویں شریف کی نیاز میں شرکت کا بلاوا دینے اپنی سہیلیوں کے گھر جا رہی تھی۔ سرسوں کے کھیت کے قریب بنی پلیا کے قریب اس نے رحمتے اور شیرا کو گھل مل کر باتیں کرتے دیکھ لیا۔ ان کی باتیں سننے کی خاطر وہ پودوں کی آڑ لیتی دونوں کے اتنے قریب چلی گئی کہ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کو بہ آسانی سن سکتی تھی۔ رحمتے نے حسب معمول لفنگوں کی طرح گلے میں ریشمی رومال باندھ رکھا تھا اور کسی لاٹ صاحب کی اولاد کی طرح پلیا سے ٹیک لگائے بیٹھا سگریٹ کا سوٹا لگاتے ہوئے شیرا سے مخاطب ہوا تھا۔

"میں تو کہتا ہوں۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ مولوی نے خود سے چھوکریوں کو پڑھانا بند کر دیا۔ سالا سانپ بھی مرگیا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی۔"

"پر ایک بات اپنی سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ ساری الٹ پلٹ کیسے ہوگئی؟" شیرا نے کہا۔

"ہو سکتا ہے اس گرو گھنٹال نے کسی پر دانت تیز کرنے کا ارادہ کیا ہو اور ناکام ہو جانے کے بعد غصے میں آکر وہ شاخ ہی کاٹ دی جس پر بلبلیں بیٹھ کر چہچہایا کرتی تھی۔" رحمتے نے کسی منجھے ہوئے بدمعاش کی طرح جواب دیا۔

"تیرے خیال میں کون ہو سکتی ہے وہ؟" شیرا نے تجسس بھرے انداز میں پوچھا۔

"کوئی بھی ہو سکتی ہے۔" رحمتے نے جلی ہوئی سگریٹ کی راکھ کو چٹکی بجا کر جھٹکتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ سالی جوانی بھی دیوانی ہوتی ہے۔ کائی کی طرح ذرا پاؤں رپٹا اور اجلے کپڑے داغ دار ہوتے دیر نہیں لگتی۔"

"کہتا تو ٹھیک ہے پر' یار نہ جانے اس بات پر اب بھی میرا دل نہیں ٹھکتا کہ مولوی عبدل متین ایسا آدمی ہو گا۔"

"یہ تیری اپنی شرافت ہے جو تو اسے اپنے جیسا سمجھ رہا ہے۔" رحمتے نے ایک بار پھر بے پر کی اڑائی۔ "ابھی پورے دو مہینے بھی نہیں ہوئے جب میں شہر گیا تھا۔ میرا ایک لنگوٹیا مجھے اپنے ساتھ کوٹھے پر لے گیا۔ وہاں میں نے خود اپنی گنہگار آنکھوں سے ایک داڑھی والے ملا جی کو مجرا سنتے دیکھا تھا۔ عیاشی کا بھی اپنا ایک چسکا ہوتا ہے پیارے اور یہ نشہ آسانی سے نہیں اترتا۔ ساٹھے پاٹھے والی مثل تو سنی ہے نا تو نے' عبدل متین تو پھر بڑا ٹھے والا ملا ہے۔ ویسے کسی کی نیت بدلنے میں دیر بھی نہیں لگتی۔"

کلثوم پودوں کے درمیان دبکی بیٹھی ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ غصے کی شدت سے اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ ایک ہی بستی میں رہنے کی وجہ سے وہ یہ بات بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ رحمتے اول درجے کا جھوٹا اور دل پھینک واقع ہوا ہے۔ دوسروں کے خلاف زہر اگلنا اس کی سرشت میں داخل تھا۔ اس کی مثال اس بھوکے کتے کی سی تھی جو چچوڑی ہوئی ہڈی کو بھی دیکھ کر اپنی زبان لپلپانے لگتا ہے' کئی بار اس کا باپ اسے راہ راست پر لانے کی خاطر چھتی سے اچھی خاصی طرح دھنک بھی چکا تھا لیکن کتے کی دم ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی رہی۔ ایک بار اس نے اکیلا پا کر نازو کی کلائی تھام لی لیکن جب نازو نے پھٹے ہوئے جوتے کی طرح اس کی مرمت شروع کی تو رحمتے نے جلدی سے اسے بہن بنا کر بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی تھی۔ اس وقت کلثوم کی بھی یہی کیفیت تھی۔ وہ شیرا کی خاطر مولوی عبدل متین کو آزما چکی تھی جو لنگوٹ کا بڑا پکا ثابت ہوا تھا۔ اسی دن سے کلثوم کے دل میں رحمتے کی طرف سے نفرت پیدا ہو گئی تھی جس نے بلاوجہ ایک شریف' نیک اور معتبر آدمی کی شخصیت پر گندگی اچھالنے کی خاطر شیرا کے کان بھر دیے تھے اور اس کی پڑھائی کا سلسلہ درمیان میں ہی ٹھپ ہو گیا تھا۔

"ہو سکتا ہے تیرا خیال ٹھیک ہو لیکن ...."

"اب یہ لیکن ویکن چھوڑ شیرا اور میری بات دھیان سے سن۔" رحمتے نے بڑے اسٹائل سے ایک سگریٹ سے دوسری سگریٹ جلاتے ہوئے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "میری مان تو اپنے باپ کو رمضو چاچا کے پاس بھیج کر کلثوم سے چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کی بات طے کرا لے ورنہ اگر کہیں چڑیا ایک بار ہاتھ سے نکل گئی تو تمام زندگی بیٹھا ہاتھ ملتا رہے گا۔"

"لیکن میری اور کلثوم کی بات تو پکی ہو چکی ہے۔" شیرا نے جواب دیا۔

"خبر ہے مجھے لیکن جب تک نکاح کے چھوارے نہ بٹ جائیں مرد کو دھینگا مشتی کرنے کا حق حاصل نہیں ہوتا۔" رحمتے نے آنکھ مارتے ہوئے نہایت کمینگی سے کہا۔ "میری ایک نصیحت کو اور گانٹھ لگا لے۔ گھوڑی اگر منہ زور ہو تو لگام کھینچ کر رکھنا پڑتا ہے ورنہ وہ سوار کو نیچے گرا کر ایسی دلکی لگاتی ہے کہ پھر اسے قابو کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"بکواس نہ کرو۔" شیرا نے برا مناتے ہوئے کہا۔ "میری کلثوم ویسی نہیں ہے جیسی تو

سمجھ رہا ہے۔"

"یہی غلط فہمی تو مرد کو مرغا بن کر ککڑوں کوں بولنے پر مجبور کر دیتی ہے۔" رحمتے بولا۔

"عورت نے ایک ذرا منہ پھاڑ کر انگڑائی لی اور مرد زن مرید ہو کر رہ جاتا ہے۔"

کلثوم برداشت نہ کر سکی تو ایک بڑا سا پتھر ہاتھ میں لیے سامنے آ گئی۔ شیرا اور رحمتے دونوں ہی ہڑبڑا اٹھے "اور یہ بھی تو بتا شیرا کو جب کوئی عورت پاؤں کی جوتی اتار کر تاج پوشی کرتی ہے تو تو اسے جھٹ بہن بنا لیتا ہے۔" کلثوم بپھری ہوئی شیرنی کی طرح بولی۔ "حرام کے تخم۔ اب بتا شیرا کو کہ منہ زور گھوڑی کو کیسے قابو کیا جاتا ہے۔"

"وہ .... وہ .... میں تو خالی پیلی اپنے یار سے ٹھٹھول بازی کر رہا تھا۔" رحمتے اچانک بھیگی بلی بن گیا۔

"اب سٹی کیوں گم ہو گئی۔ پہلے تو بڑا مرد بن کر الٹی سیدھی پٹی پڑھا رہا تھا۔ اب ہیجڑوں کی طرح کیوں منمنانے لگا۔" کلثوم نے پتھر والا ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے بڑی حقارت سے کہا۔ "اتنی دیر سے تو اپنے بہنوئی کے ساتھ ٹھٹھول بازی کر رہا تھا۔ اب تھوڑی دل لگی بہن کے ساتھ بھی کر لے۔"

رحمتے کلثوم کے تیور دیکھتے ہی بھانپ گیا تھا کہ اب اس کی خیر نہیں' یوں بھی رمضو قصائی کے نام ہی سے اس کی جان نکلتی تھی چنانچہ وہ وہاں سے نو دو گیارہ ہو جانے کے ارادے سے پلٹا ہی تھا کہ کلثوم کا پتھر والا ہاتھ گھوم گیا۔ اس کا نشانہ خطا نہیں گیا۔ تیزی سے سنسناتا ہوا پتھر رحمتے کی بائیں کنپٹی سے ذرا اوپر لگا تو اس کے سر سے بھل بھل خون نکلنے لگا' وہ چکرا کر زمین پر "ہائے مرگیا" کہتا ہو گرا تھا۔

"ارے .... یہ کیا کیا تو نے ...." شیرا نے بوکھلا کر کلثوم سے کہا۔ "اگر یہ کہیں۔"

"مر جانے دے .... اس کو" کلثوم نے اس کی پیدائش اصلیت بیان کرتے ہوئے کہا۔ "دھرتی کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔"

"اچھا چل اب غصہ تھوک دے۔" شیرا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "اپنے بابا سے کچھ نہ کہنا ...."

"کیوں ...." تیری ممتا کیوں پھڑپھڑا رہی ہے اس نیچ ذات کے لئے۔" اس نے

رحمتے کو نفرت سے گھورتے ہوئے شیرا سے کہا۔ "اس کمین نے بے چارے مولوی صاحب جیسے شریف اور نیک آدمی کی پگڑی اچھالنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی اور تو اس کی حمایت کر رہا ہے؟"

دوسری جانب رحمتے نے دونوں ہاتھوں سے چوٹ لگنے والی جگہ کو دبا رکھا تھا اور زمین پر پڑا ہائے۔ ہائے کر رہا تھا۔ پتھر لگتے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ اٹھے تھے۔

"بات حمایت کی نہیں ...." شیرا بولا۔ "اگر تو نے چاچا سے کچھ کہا تو وہ اس کی ہڈی پسلی ایک کر کے رکھ دے گا۔"

"پھر........ تجھے کیا تکلیف ہو گی۔"

"بات پھیلی تو بدنامی ہو گی اپنی ...." شیرا نے کہا۔ "بس اب بات کو یہیں دفن کر دے۔"

"تو کہتا ہے تو میں بابا سے نہیں کہوں گی لیکن ایک شرط پر ...."

"وہ کیا ....؟"

"مجھ سے وعدہ کر کہ دوبارہ تو اس کے ساتھ کبھی دوستی گانٹھنے کی کوشش نہیں کرے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" شیرا نے بات ختم کرنے کی خاطر کہا۔

"جا .... معاف کیا میں نے تجھے۔" کلثوم نے حقارت سے زمین پر تھوکتے ہوئے رحمتے سے کہا۔ "تو بھی کیا یاد کرے گا کہ کس بہن سے تیرا پالا پڑا ہے۔"

پھر جب تک کلثوم لمبے لمبے ڈگ بھرتی پگڈنڈی سے گزر کر کھیت کی آڑ میں نہیں نکل گئی رحمتے نے زمین سے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔

○

پولیس کی گشتی پارٹی کا بستی میں رات کو چکر لگانا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ہفتے میں ایک دو مرتبہ وہ اپنا فرض بھی پورا کر لیتے تھے اور غلام رسول کے گھر پر چائے پینے کے بہانے تھوڑی سے محفل بھی جما لیتے تھے۔

اس رات پولیس کی گشتی پارٹی جب راؤنڈ پر تھی تو غلام رسول بھی ان کے ہمراہ تھا۔ وہ ہنستے بولتے مسجد کے قریب والے باغ کے پاس سے گزر رہے تھے کہ اتفاق سے غلام رسول کی نظران دو انسانی سایوں پر پڑ گئی جو درختوں کی آڑ میں چھپنے کی غرض سے زمین سے اٹھے تھے۔

"کون ہے ......؟" غلام رسول نے دبنگ آواز میں للکارا۔ "خبردار ...... بھاگنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ پولیس گولی چلا دے گی۔"

پھر جب غلام رسول پولیس گشتی پارٹی کے ساتھ تیزی سے لپکتا ہوا درختوں کے جھنڈ کی دوسری طرف لپکا تو مولوی عبدل متین کو وہاں سہما کھڑا دیکھ کر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ مولوی صاحب سے چھپنے کا سبب پوچھنے ہی والا تھا کہ ایک پولیس والے کی آواز اس کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اترتی چلی گئی۔

"بھائی غلام رسول ...... یہاں تو کام ہی کچھ اور ہو رہا تھا۔ ادھر آکر دیکھو' گھاس پر شکن آلود چادر اور ایک مسکی ہوئی زنانی اوڑھنی بھی پڑی ہے۔ یہ تو کہانی ہی دوسری ہے۔"

پولیس والے کی ٹارچ کی روشنی میں غلام رسول نے چادر اور زنانی اوڑھنی دیکھی اور پھر اس نے مولوی عبدل متین کے سہمے ہوئے چہرے پر نظر ڈالی تو ایک لمحے کے لیے گنگ سا ہو گیا' دوسرے پولیس والوں کی طرح اس کے اپنے ذہن میں بھی جو کہانی ابھری تھی وہ فوراً ہی اس پر بھروسا کر لینے کو تیار نہیں تھا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑے مولوی عبدل متین کو گھورتا رہا' پولیس والوں نے اتنی دیر میں قرب جوار کا کونا کونا چھان مارا لیکن اوڑھنی والی کا سراغ نہیں مل سکا' شاید وہ خطرے کی بو سونگھتے ہی رفو چکر ہو گئی تھی۔

"مولوی صاحب۔" غلام رسول نے حیرت سے پوچھا۔ "یہ سب کیا ہے؟"

مولوی عبدل متین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چوروں جیسے انداز میں بس نظریں جھکائے کھڑے رہے۔

"بھائی غلام رسول' تمہارا یہ مولوی تو بڑا چھپا رستم نکلا۔" ایک پولیس والے نے مولوی متین کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔

"اکیلے ہی اکیلے گل چھرے اڑا رہا تھا۔" دوسرا بولا۔ "پیارے ہمیں کم از کم دیدار ہی کرا دیا ہوتا۔ ہم بھی آنکھیں سینک لیتے۔"

"ذرا صورت دیکھو' کیسا فرشتہ لگ رہا ہے اور کرتوت۔" تیسرے نے نفرت سے کہا۔

"توبہ توبہ ...... پیش امام ہو کر منہ کالا کرتا پھرتا ہے۔"

"تم لوگ ذرا ایک منٹ ٹھہرو ......" غلام رسول' مولوی عبدل متین کا ہاتھ تھام کر کچھ دور لے جا کر بولا۔ "سچ سچ بتا دو مولوی صاحب ...... کون تھی تمہارے ساتھ۔"

مولوی عبدل متین نے نظریں اٹھا کر غلام رسول کو ایک نظر دیکھا پھر دوبارہ مجرموں کی طرح نظریں جھکا لیں۔

"کب سے چلا رہے ہو یہ گھناؤنا چکر۔" غلام رسول کو اپنی بستی کی عزت کا خیال آیا تو اس کے تیور بھی بدل گئے۔ "اب تک کتنی معصوم بچیوں کو اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھا چکے ہو؟"

جواب میں مولوی عبدل متین نے خاموشی اختیار رکھی۔

"جانتے ہو اگر تم نے شرافت سے زبان نہ کھولی تو کیا ہو گا؟ پولیس والے مار مار کر تمہارا بھرکس نکال دیں گے۔ ابھی رات کی تاریکی میں معاملہ رفع دفع بھی کیا جا سکتا ہے۔ صبح ہو گئی تو بستی میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔ ایک بار ایف آئی آر کٹ گئی تو پھر لمبی سزا بھی ہو سکتی ہے۔"

غلام رسول کے علاوہ دوسرے پولیس والوں نے بھی بہتیری کوشش کی لیکن مولوی عبدل متین ٹس سے مس نہ ہوئے چنانچہ انہیں باقاعدہ حراست میں لے لیا گیا۔

صبح ہوئی تو مولوی متین کی گرفتاری کی اطلاع جنگل کی آگ کی طرح بستی کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل گئی۔ ہر طرف اسی بات کا چرچا تھا۔ بستی کے بڑے بوڑھے ٹولیوں کی شکل میں بیٹھے چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ کسی دشمن نے مولوی صاحب کو بلا وجہ پھنسوانے کی کوشش کی ہے تا کہ ان کے راستے سے ہٹنے کے بعد مسجد کی امامت کا فرض اس کو مل جائے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ شہر جا کر سب سے پہلے مولوی عبدل متین کو ضمانت پر چھڑانے کا بندوبست کیا جائے اس کے بعد اصل معاملے کی چھان بین کی جائے' نئی نسل کے لڑکوں کی ٹولی اور خاص طور پر رحمتے کو لیڈروں کی طرح مولوی عبدل متین کے خلاف زہر اگلنے کا موقع مل گیا تھا۔ بہر حال ایک بات پر سب ہی متفق تھے کہ بستی کی جوان لڑکیوں کو کوئی بھانڈا پھوٹنے سے پہلے ہی ہاتھ

پہلے کر کے رخصت کر دیا جائے۔

شام کو جب غلام رسول نے چوکی سے واپس لوٹ کر مولوی صاحب کے گناہ کی کہانی سنائی تو سب کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ بس ایک کلثوم تھی جسے اس کہانی پر یقین نہیں آ رہا تھا' اس لیے کہ وہ مولوی عبدل متین کو آزما کر دیکھ چکی تھی۔

○

عدالت کے کٹہرے میں بھی مولوی عبدل متین سر جھکائے خاموش کھڑا رہا' اسے سرکار کی جانب سے وکیل مہیا کیے جانے کی پیش کش بھی کی گئی لیکن اس نے انکار کر دیا۔

عدالت کا کمرا اس وقت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جب وکیل سرکار مولوی عبدل متین کی شرافت کی دھجیاں اڑا رہا تھا۔ بستی کے کچھ لوگ بھی وہاں موجود تھے جو کٹہرے میں مجرموں کی طرح نظریں جھکائے ہوئے مولوی عبدل متین کو حقارت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

سب سے پہلے مقدس کتاب کو درمیان میں لا کر مولوی عبدل متین سے کہلوایا گیا کہ۔ "میں خدا کو حاضر ناظر جان کر قسم کھاتا ہوں کہ جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ اور نہیں کہوں گا۔"

عدالت میں موجود افراد نے خاص طور پر اس بات کو محسوس کیا کہ مقدس کتاب پر ہاتھ رکھتے ہوئے مولوی عبدل متین کا سارا وجود اس طرح کپکپا رہا تھا جیسے اسے جاڑا چڑھ کر بخار آ گیا ہو' قسم کھاتے ہوئے اس کی آواز بھی بھرا گئی تھی۔

"مولوی عبدل متین۔" وکیل سرکار نے چٹخارا لیتے ہوئے جرح شروع کی۔ "کیا یہ درست ہے کہ پولیس کی گشتی پارٹی نے آپ کو بستی رام نگر سے مورخہ گیارہ دسمبر کو رات کے تقریباً" بارہ اور ایک بجے کے درمیان آپ کی رہائش گاہ سے ملحقہ باغ سے حراست میں لیا تھا۔"

"جی ہاں ...." مولوی عبدل متین نے نظریں جھکائے جھکائے مدھم آواز میں جواب دیا۔

"جس مقام سے آپ کو پکڑا گیا تھا وہاں سے ایک شکن آلود چادر اور ایک عدد مسکی ہوئی زنانی اوڑھنی بھی برآمد ہوئی تھی۔" وکیل سرکار نے پوچھا۔ "کیا آپ اس بات سے

انکار کریں گے۔"

"جی نہیں ...."

"پولیس کی گشتی پارٹی اور جائے وقوعہ سے ملنے والی چیزوں کے پیش نظر اس شے کو تقویت ملتی ہے کہ آپ کو جس وقت حراست میں لیا گیا اس سے چند لمحے پیشتر کوئی صنف مخالف بھی آپ کے ساتھ موجود تھی .... کیا یہ قیاس غلط ہے؟"

"جی نہیں ...."

"گویا گشتی پارٹی کے پہنچنے سے پہلے آپ کسی کے ساتھ محو اختلاط تھے۔" وکیل نے جان بوجھ کر اپنے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ محو اختلاط کا مطلب سمجھتے ہیں یا مجھے کھل کر اس کی تشریح کرنے کی ضرورت ہے۔"

"م .... م .... سمجھ رہا ہوں کہ آپ کا مقصد کیا ہے۔" مولوی عبدل متین نے مردہ آواز میں جواب دیا۔

"بہت خوب۔" وکیل سرکار نے طنزیہ انداز میں زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہر چند کہ پولیس کی گشتی پارٹی دوسرے فریق کو گرفتار نہیں کر سکی لیکن عدالت کے رو برو آپ کے جواب سے صاف ظاہر ہے کہ آپ اس دوسری شخصیت سے بھی ضرور واقفیت رکھتے ہیں جو ابھی تک پولیس کی دسترس سے باہر ہے۔"

مولوی عبدل متین نچلا ہونٹ چبانے لگے۔ جواب میں کچھ نہیں کہا۔

"کیا آپ اس کا نام بتانے کی زحمت گوارا کریں گے جس نے آپ جیسے عابد و زاہد کے قدم بھی ڈگمگا دیے تھے۔"

مولوی عبدل متین نے اپنے ہونٹوں کو اور سختی سے بھینچ لیا۔ ان کی نگاہیں جیسے عدالت کے پختہ فرش پر گڑ کر رہ گئی تھیں۔

"آپ کی خاموشی محترم عدالت کو یہ سوچنے پر بھی آمادہ کر سکتی ہے کہ آپ دیدہ و دانستہ قانون کی نظروں سے حقائق کی پردہ پوشی کرنے کے جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔"

"اگر فاضل عدالت میری خاموشی کو میرا جرم تصور کرتی ہے تو میں اس کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔" مولوی عبدل متین نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میں کسی دوسرے کے اجلے دامن پر بدنامی کا داغ لگانے کو گناہ سمجھتا ہوں۔"

"اور وہ عمل جو آپ سے سرزد ہو رہا تھا یا ہو چکا تھا کیا آپ اسے ثواب کے زمرے میں شمار کریں گے؟" وکیل نے کچھ ایسے معصوم مگر چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا کہ عدالت میں موجود حاضرین کا قہقہہ گونج اٹھا۔ انصاف کی کرسی پر بیٹھا ہوا منصف بھی کوشش کے باوجود اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ پا سکا لیکن اس کی باریک بین نگاہیں بدستور عبدل متین کے چہرے پر مرکوز تھیں جو وکیل سرکار کی بات سننے کے بعد شرم سے پانی پانی ہوا جا رہا تھا۔ اس کی گرفت کٹہرے پر اور سخت ہو گئی۔ شاید وہ خود پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا یا پھر عدالت میں موجود افراد سے نگاہیں ملانے کے قابل نہیں رہ گیا تھا۔

"جناب والا۔" اچانک وکیل سرکار نے عدالت سے مخاطب ہوتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ مجرم عبدل متین کے جوابات' جائے وقوعہ سے ملنے والی اشیاء او مجرم کی حقائق سے پردہ پوشی اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ پولیس کی گشتی پارٹی نے اپنی رپورٹ میں جس گھناؤنے فعل کی طرف اشارہ کیا وہ فرضی نہیں حقیقت ہے چنانچہ میں عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ مجرم عبدل متین کو جسے بستی کے بھولے بھالے اور شریف لوگوں نے مسجد کے پیش امام ہونے کے مقدس فرض سے نوازا تھا اتنی سخت اور کڑی سزا دی جائے کہ لوگ اس سے عبرت حاصل کریں اور پھر کوئی دوسرا شخص مذہب کے تقدس میں گناہ کی آمیزش کرنے کی جرات نہ کر سکے۔ مجھے اس کے سوا اور کچھ نہیں کہنا۔"

ایک ہفتے کے بعد جب مولوی عبدل متین کو دوبارہ عدالت کے رو برو پیش کیا گیا تو فاضل عدالت نے بہت غور و خوض کے بعد دلائل اور شبہے کی گنجائش کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مولوی عبدل متین کو چھ ماہ قید محض کی سنا دی۔

○

اس روز رمضان قصائی جو پوری بستی کے بڑے بوڑھوں میں رمضو کے نام سے مشہور تھا شام کو سو کر اٹھا تو چائے پانی سے فراغت کرنے کے بعد لباس تبدیل کر کے سیدھا غلام رسول کی طرف چلا گیا جو اس وقت اپنی بیٹھک میں تنہا موجود تھا۔

"آؤ رمضو استاد۔" غلام رسول نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "آج غلطی سے ادھر کا راستہ کیسے بھول گئے۔ کیا شیرا اور کلثوم کی تاریخ پکی ہونے کی خوشخبری

سنانے آئے ہو۔"

"بزرگوں نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ دائی سے پیٹ نہیں چھپایا جا سکتا۔" رمضو نے مسکرا کر کہا۔ "اور دائی اگر پولیس کے محکمے کی ہو تو وہ دور ہی سے خوشبو سونگھ کر سب کچھ کھنگال لیتی ہے۔"

"کون سی تاریخ پکی کی ہے۔"

"اگلے مہینے کی نو ...... چاند کا حساب کتاب مجھے نہیں آتا پر میری گھر والی بتا رہی تھی شاید اس روز چاند کی بارہ تاریخ ہو گی۔"

"مبارک ہو تمہیں ...... لیکن مجھے ایک شکایت رہے گی۔ تم مٹھائی لے کر نہیں آئے۔ خوشخبری کے ساتھ ساتھ دیسی گھی کی بالوشاہی یا موتی چور کے لڈو ہوں تو پھر مزہ بھی دوبالا ہو جاتا ہے۔ بہر حال ایک بات مجھے پہلے سے معلوم ہے۔ کلثوم کی شادی تو بڑی دھوم دھڑکے سے کرے گا کیوں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ......"

"ایک ہی لڑکی ہے بھائی غلام رسول۔ اس کی شادی پر ڈنڈی نہیں ماروں گا۔ پوری بستی والوں کو دعوت دوں گا اور ایسے اصیل اور کڑیل جانور کا گوشت کھلاؤں گا کہ سب ہاتھ چاٹتے رہ جائیں گے۔"

"پر میرے لئے اس خوشخبری کا اصلی گھی کی مٹھائی کا ڈبا الگ سے ہونا چاہئے۔"

"مجھے خبر ہے کہ تو پولیس کا ملازم ہے۔" رمضو نے مسکرا کر غلام رسول کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ "فکر نہ کر ...... تیرا مٹھائی کا ڈبا رمضو پر ادھار رہا ......"

کچھ دیر تک دونوں کلثوم اور شیرا کی شادی کی باتیں کرتے رہے پھر رمضو نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"مولوی عبدل متین کی رہائی میں اور کتنے دن باقی رہ گئے ہیں۔"

"خیریت تو ہے ...... آج تجھے یہ اچانک اس مولوی کی یاد کیسے آ گئی۔" غلام رسول نے حیرت سے پوچھا۔

"جانور بھی کچھ دنوں باڑے میں ایک ساتھ بندھتے ہیں تو آپس میں یارانہ گانٹھ لیتے ہیں۔ ایک دوسرے میں گھل مل جاتے ہیں۔" رمضو نے لمبی سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

"ہم تو پھر انسان ہیں ...... اتنے دنوں اس کے پیچھے ہاتھ باندھ کر نماز پڑھی ہے۔ کبھی

کبھی یاد تو آ ہی جاتی ہے۔ دیکھنے میں تو اچھا خاصا بھلا مانس نظر آتا تھا لیکن ...."

"چھوڑ یار۔ تو بھی کس کی باتیں کر رہا ہے۔" غلام رسول نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ ہم نے اس بدبخت کے پیچھے جو نمازیں پڑھی ہیں وہ قبول بھی ہوں گی یا نہیں۔"

"تو ایسا مت بول ...." رمضو نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تیرا اور مولوی کا خاصا یارانہ تھا۔"

"بیٹھ تو سہی ...." غلام رسول نے رمضو کو دوبارہ بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے راز داری سے پوچھا۔ "تیرا کیا خیال ہے اس خرانٹ مولوی کے بارے میں ...."

"کیا مطلب ...."

"ایک ہفتے بعد اس کی سزا پوری ہو رہی ہے۔" غلام رسول بولا۔ "میں پرسوں اس سے ملنے بڑی جیل گیا تھا۔"

"پھر........"

"پھر کیا .... میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ بستی میں قدم رکھنے کے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اسے اپنے تمام ٹبر کے ساتھ نو دو گیارہ ہونا پڑے گا ورنہ ہم دھکے مار کے اسے نکال باہر کریں گے۔" غلام رسول نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں خود جا کر اسے اسٹیشن پر گاڑی میں بٹھا کر آؤں گا! ایسی کھری کھری سناؤں گا کہ پھر وہ بھولے سے بھی پلٹ کر ادھر کا رخ کرنے کی ہمت نہیں کرے گا۔"

"جیسی تیری مرضی ...." رمضو نے سنجیدگی سے کہا۔ "برے کام کا انجام ہمیشہ برا ہی ہوتا ہے۔"

"پھانسی کا خوف نہ ہوتا تو میں جیل سے باہر قدم رکھتے ہی اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو کھلا دیتا ...." غلام رسول کے لہجے میں نفرت کا احساس کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔

"ایک بات پوچھوں ...." رمضو نے اس بار بڑی راز داری سے دھیمی آواز میں کہا۔

"کیا ....؟"

"کیا مولوی نے ابھی تک اس چھوکری کا نام نہیں بتایا؟"

"نہیں ...." غلام رسول نے پولیس والوں جیسے انداز میں کہا۔ "مگر بڑ گھٹالوں کی وار داتوں میں وہ مجھے پکا اور عادی مجرم لگتا ہے۔"

"بہر حال اس کا ایک احسان بھی ہے ہم پر ...."

"وہ کیا ....؟" غلام رسول نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ کیسا بھی ہے لیکن اس نے ایک خاندان کو بدنامی کا داغ لگنے سے ضرور بچا لیا۔" رمضو نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا پھر خاموشی سے اٹھا اور غلام رسول سے ہاتھ ملا کر بوجھل بوجھل قدم اٹھاتا بیٹھک سے باہر نکل گیا۔

○

مولوی عبدل متین تانگے پر بیوی بچوں اور مختصر سے سازو سامان کے ساتھ بیٹھا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ ایک دو بار اس نے نظریں گھما کر دیکھا۔ غلام رسول اپنی موٹر سائیکل پر تانگے کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ تانگے والا بھی غلام رسول ہی کے کہنے پر اسٹیشن جانے پر آمادہ ہوا تھا ورنہ پہلے تو اس نے بڑے کھرے انداز میں صاف صاف جواب دیا تھا۔

"کوئی اور سواری تلاش کر لو مولوی صاحب .... میں عزت دار آدمی ہوں۔"

راستے بھر اس نے بھی مولوی عبدل متین سے کوئی بات نہیں کی۔ اسٹیشن پہنچ کر مولوی عبدل متین نے اسے کرایہ دینا چاہا تو اس نے ایک بار پھر بڑی حقارت سے کہا۔

"میں دن بھر اپنا اور گھوڑے کا دانہ پانی تلاش کرنے کی خاطر محنت مجوری ضرور کرتا ہوں پر حرام کی نہیں کھاتا ...."

مولوی عبدل متین دل مسوس کر رہ گئے۔ قلی کے ذریعہ سامان اٹھوا کر اسٹیشن پر پہنچے تو گاڑی تیار ہی کھڑی تھی۔ بیوی بچوں کو ساز و سامان کے ساتھ زنانہ ڈبے میں بٹھا کر انہوں نے قلی کو اس کی محنت کا معاوضہ ادا کیا تو وہ سلام کر کے دوسرے مسافروں کی طرف دوڑ گیا۔ قلی نے ان کے استفسار پر بتایا تھا کہ گاڑی چھوٹنے میں چھ سات منٹ اور باقی ہیں۔ نہ جانے کیوں آج ان کا گلا بار بار بڑی شدت سے خشک ہو رہا تھا۔ کوئی سلگتی

ہوئی چنگاری ابھی ان کے وجود کے اندر باقی رہ گئی تھی۔ جسے بجھانے کی خاطر وہ رہ رہ کر پانی کا سہارا لے رہے تھے۔ اس وقت بھی وہ اسٹیشن پر لگے ہوئے نلکے کی سمت پانی پینے کے ارادے سے پلٹے تھے لیکن غلام رسول کو پلیٹ فارم پر گیٹ کے قریب کھڑا دیکھ کر رک گئے۔ دونوں کی نگاہیں بس ایک لمحے کو چار ہوئیں پھر غلام رسول نے بڑی حقارت سے اپنی نظریں پھیرلیں۔ مولوی عبدل متین کے دل پر ایک چرکا سا لگا تو سلگتی ہوئی چنگاری ہوا پا کر کچھ اور بھڑک اٹھی کچھ دیر تک وہ خاموش کھڑے غلام رسول کو بڑی حسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔ پوری بستی میں ایک اسی سے تو ان کی گاڑھی چھنتی تھی لیکن آج وہ بھی ان کی صورت دیکھنے کا روا دار نہیں تھا۔

گاڑی چھوٹنے میں اب پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ مولوی متین کچھ سوچ کر غلام رسول کے قریب چلے گئے۔ بڑے دکھ بھرے لہجے میں بولے۔ "میں تمہاری بستی چھوڑ کر جا رہا ہوں غلام رسول۔ ہمیشہ کے لیے .... لیکن .... تمہاری دوستی کو کبھی بھول نہیں سکتا۔"

غلام رسول نے کوئی جواب نہیں دیا' منہ پھیرے کھڑا رہا' شاید وہ ان کی صورت دیکھنے کا بھی روا دار نہیں تھا۔

"کیا ایک رخصت ہوتے دوست کو آخری بار خدا حافظ بھی نہیں کہو گے؟" مولوی عبدل متین کے لہجے میں کرب تھا۔

غلام رسول بدستور خاموش رہا' کسی پتھر کے بت کی مانند جو ہر احساس سے بے نیاز ہوتا ہے۔ "میرے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہے میرے دوست۔" مولوی عبدل متین نے مدھم آواز میں کہا۔ "ایک پھانس میرے اندر ابھی تک چبھی ہوئی ہے۔ اگر وہ نہ نکلی تو شاید تمام زندگی اس کی نوک میرے وجود کو زخمی کرتی رہے گی۔"

غلام رسول نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔

"مجھے آج بھی یاد ہے میرے یار .... تم نے بیرسٹر شوکت مرزا کی لڑکی اور پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے بیٹے امجد کی روداد سناتے ہوئے کہا تھا .... عزت اگر ایک بار خاک میں مل جائے تو پھر قانون کی کوئی دفعہ اسے بحال نہیں کر سکتی۔ بدنامی کے داغ کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا .... اور ٹوٹے ہوئے شیشے کو خواہ کتنی ہی چابکدستی سے کیوں نہ

جوڑا جائے اس میں پڑا ہوا بال نہیں جاتا۔"

"اب ان باتوں کا وقت گزر چکا ہے۔" غلام رسول نے نفرت سے کہا۔ "تمہاری گاڑی چھوٹنے میں دو تین منٹ باقی رہ گئے ہیں۔"

"جانوروں میں زیادہ سوجھ نہیں ہوتی لیکن پیاس کی شدت سے وہ بھی تڑپ اٹھتے ہیں .... میں تو پھر انسان ہوں۔" مولوی عبدل متین کی آواز بھرانے لگی۔ "ایک بیوی اور چار بچوں کا باپ ہوں۔ تم لوگوں نے مجھ پر بڑی مہربانی کی جو ایک کمرے کا مکان سر چھپانے کو دے دیا تھا۔ وہ میرے لیے عزت کی زندگی گزارنے کے لیے بہت کافی تھا۔ میں بستی والوں کا یہ احسان آخری سانس تک نہیں بھولوں گا لیکن ...."

گارڈ نے پہلی سیٹی بجائی اور مولوی عبدل متین کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔

"لیکن کیا ...." غلام رسول نے تیزی سے پوچھا۔

"خدا گواہ ہے کہ میں نے بستی کی تمام لڑکیوں کو ہمیشہ اپنی بیٹی کی طرح سمجھا ہے۔" مولوی عبدل متین کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

"پھر وہ بد کردار کون تھی جس کی مسکی ہوئی اوڑھنی سے اب پولیس والے مسکرا مسکرا کر اپنے بوٹ صاف کرتے ہیں۔" غلام رسول نے بڑا گہرا طنز کیا۔

"آج .... آج میں اسی پھانس کو نکال دینا چاہتا ہوں .... وہ .... وہ اوڑھنی تمہاری بھابی کی تھی۔"

اسی وقت تیسری سیٹی کے ساتھ ہی گاڑی نے پلیٹ فارم چھوڑ کر اپنی اگلی منزل کی طرف رینگنا شروع کیا تو مولوی عبدل متین نظریں جھکائے تیزی سے پلٹے اور تیسرے درجے کے ایک ڈبے کے مسافروں کی بھیڑ کے اندر گم ہو گئے۔ غلام رسول کو جیسے سکتا ہو گیا۔ بڑی دیر تک وہ پلیٹ فارم پر کھڑا گاڑی کو نگاہوں سے اوجھل ہوتے دیکھتا رہا۔ اس کے ذہن میں ایک سوال پھانس ہی بن کر چبھ رہا تھا۔

"مولوی عبدل متین کو اپنی پیاس بجھانے کے جرم میں جیل کے اندر کیسے کیسے اذیت ناک لمحوں سے ہو کر گزرنا پڑا ہو گا؟"

چوراہے کے پھول

شیر باز خان اس کا اصل نام تھا لیکن وہ پورے محلے میں شیرو کے نام سے مشہور تھا۔ بڑا ہی نڈر اور بے خوف طبیعت کا مالک تھا مگر محلے والوں کے ساتھ اس کا برتاؤ بڑا برادرانہ تھا۔ اس کی صحت قابل رشک تھی۔ بھرا بھرا گول چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، چوڑا چکلا سینہ اور انار کے دانوں کی طرح سرخ سرخ رنگت۔

جب سے وہ گڑھی کی سرائے میں آ کر ٹھہرا تھا وہاں کے تمام غنڈوں نے لنگوٹ کھول دیئے تھے۔ قرب و جوار کے محلے کے بدمعاشوں کی سرگرمیوں میں بھی نمایاں کمی آ گئی تھی۔ شروع شروع میں تو لوگوں نے شیرو یا اس کے بڑی بڑی مونچھوں والے رام پوری پٹھان باپ کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی لیکن چند ہی روز بعد ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ بدمعاشوں نے شیرو کا لوہا مان لیا اور شرفا نے شیرو کی شخصیت کو اپنا نجات دہندہ سمجھ کر اس کی آؤ بھگت شروع کر دی۔

شیرو نے گڑھی کی سرائے میں جو مکان کرائے پر لیا تھا اس سے تین چار مکان چھوڑ کر روشن خان کا مکان تھا۔ روشن خان پورے شہر میں شیطان کی طرح مشہور تھا۔ بیشتر تھانوں میں وہ بڑی پابندی سے ادائیگی کرتا تھا اس لئے پولیس والے بھی اس کے معاملے میں کنی کتراتے تھے۔ روشن خان نے دس بارہ افراد پر مشتمل ایک ٹولی بنائی ہوئی تھی۔ جس کا کام شہر کے دوسرے بدمعاشوں سے دھونس دھمکی دے کر رقمیں وصول کرنا تھا۔ شہر میں اس کے دو چار اڈے بھی چلتے تھے جہاں کھلے عام جوا کھیلا جاتا تھا۔ ایک دو شراب کی بھٹیاں بھی تھیں جس کی معقول آمدنی روشن خان کو ملتی تھی۔

بات اگر یہیں تک محدود رہتی تو شاید شیرو اور روشن خان کا ٹکراؤ کبھی نہ ہوتا لیکن روشن خان چونکہ جوان لڑکیوں کے سلسلے میں بہت کھیل کھیلنے کا عادی تھا اس لئے شیرو

سے اس کی بن نہ سکی اور نتیجے کے طور پر روشن خان کو نہ صرف یہ کہ محلہ چھوڑنا پڑا بلکہ دو چار بار کی ناکامی کے بعد اس نے بھی شیرو کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔

شیرو اور روشن خان کے ٹکراؤ کی وجہ ایک اسکول ماسٹر کی نوجوان لڑکی ثابت ہوئی جو ان دنوں کالج میں زیر تعلیم تھی۔ اسکول ماسٹر اور شیرو کے گھر کے مابین دیوار مشترک تھی اس لئے پہلے ہی دن سے عورتوں کا میل جول شروع ہو گیا۔ اسکول ماسٹر کی بیوی نے شیرو کی ماں کو باتوں باتوں میں روشن خان کی بدمعاشیوں کے دو چار قصے بھی سنائے جن کی بھنک شیرو کے کان تک پہنچ گئی۔ پھر کچھ ہی دن بعد اسکول ماسٹر کی بیوی گرمیوں کی ایک دوپہر کو بدحواس حالت میں روتی پیٹتی شیرو کے گھر پہنچی اور اس کی ماں کو بتایا کہ روشن خان کے ساتھی اس کی لڑکی کو کالج سے واپسی پر اٹھا لے گئے ہیں۔ شیرو اس وقت گھر پر موجود تھا۔ زنان خانے میں ہونے والی باتیں اس کے کانوں میں پڑیں تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے بیٹھک سے اپنی لاٹھی اٹھائی اور کسی سے کچھ کہے سنے بغیر روشن خاں کے مکان پر پہنچ کر اسے للکارا۔ روشن خان اس وقت شراب کے نشے میں دھت تھا۔ اس کے دو چار ساتھی بھی وہاں موجود تھے۔ ایسی صورت میں بھلا وہ شیرو کو کیسے خاطر میں لا سکتا تھا سینہ تان کر باہر آیا اور شیرو کو ایک گندی گالی دے کر پوچھا۔

"کیا بات ہے بے ——— کیوں شور مچا رہا ہے؟"

"روشن خان ——— میں ماسٹر جی کی لڑکی کو لینے آیا ہوں۔" شیرو نے لاٹھی پر اپنی گرفت جماتے ہوئے کہا۔

"کیوں ——— کیا وہ تیری بہن لگتی ہے۔" روشن خان نے حقارت سے جواب دیا پھر بڑی رعونت سے بولا۔ "نئے آئے ہو اس محلے میں اس لئے تمہیں میرے دروازے تک آنے کی جرات ہو گئی۔ روشن خان کا نام نہیں سنا۔ زندگی پیاری نہیں ہے کیا؟ خیریت چاہتے ہو تو چپ چاپ چلے جاؤ ورنہ ———"

"ورنہ کیا ہو گا؟" روشن خان کی بات سن کر شیرو کے تیور اور زیادہ خراب ہو گئے۔

"بتاؤں پھر کیا ہو گا ———" روشن خان نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے

ہوئے کہا ———— پھر اپنے ایک ساتھی کو مخاطب کر کے بولا۔ "نواب علی ذرا اس کو سمجھا دے کہ روشن خان کی طرف آنکھ اٹھانے والے کا انجام کیا ہوتا ہے۔"

نواب علی چھریرے بدن کا مالک تھا۔ اس نے روشن خان کا اشارہ پایا تو بڑی برق رفتاری سے نیفے سے چاقو نکال کر شیرو کی طرف بڑھا۔ اپنی جگہ شیرو بھی پوری طرح تیار تھا۔ لاٹھی چلانے کے معاملے میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا چنانچہ نواب علی لاٹھی کے پہلے ہی وار میں لوٹ پوٹ ہو گیا۔ روشن خان اور اس کے باقی دو ساتھی بیک وقت ٹوٹ پڑے لیکن شیرو نے انہیں قریب نہیں پھٹکنے دیا۔ اس کی لاٹھی مشینی انداز میں چلتی رہی۔ پھر اس نے روشن خان کو مخاطب کر کے کہا۔

"روشن خان ———— مجھے مجبور نہ کرو ورنہ تم سب کا انجام خراب ہو گا۔ ماسٹرجی کی لڑکی واپس کر دو تو ہمارا تمہارا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔"

جواب میں روشن خان کے ساتھی نے جو گالی شیرو کو دی وہ اس کے لئے نا قابل برداشت تھی چنانچہ شیرو نے پینترا بدل کر ہاتھ گھمایا تو گالی دینے والا لہو لہان ہو گیا۔ ابھی وہ اپنا توازن برقرار رکھنے کی خاطر لڑکھڑا ہی رہا تھا کہ شیرو نے روشن خان کو بچا کر اس کے دوسرے ساتھی کی کمر پر ایسی بھرپور ضرب لگائی کہ وہ بلبلاتا ہوا نالی میں لڑھک گیا۔ اب صرف روشن خان اس کے مقابلے پر باقی رہ گیا تھا جو انتہائی کائیاں اور موقع شناس تھا۔ اپنے تین ساتھیوں کا عبرت ناک انجام دیکھ کر اسے پسینے آ گئے لہٰذا اس نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے شیرو کو مخاطب کیا۔

"ماسٹر کی لڑکی سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟"

"وہی جو ایک مسلمان کا دوسرے سے ہوتا ہے ———— اس کے علاوہ وہ میری پڑوسن بھی ہے۔" شیرو نے لاٹھی روکتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے ———— تم اسے لے جا سکتے ہو۔"

شیرو نے روشن خان کی کوٹھڑی میں جا کر اسکول ماسٹر کی بیہوش لڑکی کو اٹھایا اور جاتے جاتے روشن خان سے کہتا گیا کہ اگر اس نے دوبارہ کبھی کسی مجبور لڑکی پر بری نظر ڈالی تو اس کا انجام خطرناک ہو گا۔ روشن خان خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو گیا۔ لیکن اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ پہلی فرصت میں شیرو کو ٹھکانے لگانے کی

کوشش ضرور کرے گا۔

اسکول ماسٹر کی لڑکی کا اغوا اور اس کی بازیابی کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا۔ روشن خان کئی بار اس لڑکی کو راستے میں چھیڑ چکا تھا اور ہر بار لڑکی نے اسے دھتکار دیا تھا۔ جب وہ سیدھے طریقے سے لڑکی کو زیر نہ کر سکا تو اس نے یہ شرمناک طریقہ اختیار کیا۔ روشن خان کے ہاتھوں اغوا کی ہوئی لڑکی کا مستقبل کیا ہوتا۔ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ———— کس میں جرات تھی کہ روشن خان سے اس سنگین واقعے پر لڑتا۔ اگر شیرو نہ ہوتا تو ایک معصوم لڑکی تباہ ہو جاتی۔

شیرو کے اس کارنامے نے محلے کے ان شرفا کی زبان کھول دی جو اب تک خاموش تھے۔ آٹھ دس آدمیوں کی ٹولی اسی وقت تھانے پہنچی سب نے یک زبان ہو کر روشن خان کے خلاف بیان دیا۔ تھانے پر اس وقت جو افسر موجود تھا اس نے محلے والوں کو دکھانے کی خاطر باقاعدہ لکھا پڑھی کی اور روشن خان کو گرفتار بھی کر لیا لیکن اسی شام اسے لے دے کر چھوڑ دیا۔ بعد میں کیا ہوا اس کا علم کسی کو نہ ہو سکا۔ بہر حال روشن کے خلاف چونکہ پہلی بار کسی نے خم ٹھونکنے کی جرات کی تھی اس لئے اس حادثے کی اطلاع جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی اور شیرو کے نام کا چرچا بھی شروع ہو گیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ روشن خان فوری طور پر جوابی حملہ کرے گا اور شیرو کی لاش کسی ویرانے سے دستیاب ہو سکے گی ———— لیکن روشن خان کی طرف سے کوئی جوابی کاروائی نہیں کی گئی۔

پانچ روز تک گڑھی کی سرائے میں مکمل امن رہا۔ اس عرصے میں روشن خان کی شکل بھی بہت کم لوگوں کو نظر آئی ورنہ عام حالات میں وہ ہمیشہ اپنے مکان کے باہر گلی میں پلنگ بچھائے بیٹھا رہتا تھا۔ محلے والوں کا خیال تھا کہ اب روشن خان کے کس بل نکل چکے ہیں اس لئے اس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے۔ لیکن ان کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ جس روز شیرو اور روشن خان کا ٹکراؤ ہوا تھا اس کے ٹھیک چھ روز بعد نصف رات گزری تھی کہ روشن خان اپنے دس بارہ آدمیوں کے ساتھ جو چاقو چھروں سے لیس تھے شیرو کے مکان پر ٹوٹ پڑا ———— گلی میں شور و غل ہوا تو محلے کے دوسرے افراد بھی اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے جو منظر دیکھا

وہ بڑا ہی درد ناک تھا۔ شیرو کا باپ گلی کے درمیان خون میں لت پت پڑا تڑپ رہا تھا اور شیرو بیک وقت اپنے باپ کی حفاظت بھی کر رہا تھا اور دشمنوں کی سرکوبی بھی کر رہا تھا۔ اس کا بایاں بازو زخمی نظر آ رہا تھا۔ لیکن اس کی پھرتی قابل دید تھی جب تک دوسرے لوگ قریب پہنچتے اور بیچ بچاؤ کراتے شیرو، روشن خان کے سات آدمیوں کو زمین چٹا چکا تھا۔ روشن خان نے موقع کی نزاکت کو محسوس کر کے جائے وقوع سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اتنی دیر میں کچھ لوگ پولیس کو ساتھ لے آئے۔ چنانچہ روشن خان نے چھرا پھینک کر خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس کے باقی ساتھیوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ پولیس نے شیرو کو ساتھ لے جانے کی کوشش کی تو سارا محلّہ اس کی طرف سے بول پڑا لہٰذا پولیس نے اسے چھوڑ دیا۔ محلے والوں نے اس کے باپ کو اسی وقت لے جا کر اسپتال میں داخل کرا دیا۔

ایک بار پھر تھانہ کچہری تک بات پہنچی لیکن اس بار بھی روشن خان جوڑ توڑ کر کے صاف بچ گیا البتہ اتنا ضرور ہوا کہ اس نے گڑھی کی سرائے چھوڑ دی اور وہاں سے کیٹ گنج کے علاقے میں منتقل ہو گیا۔ شیرو کے زخم زیادہ گہرے نہیں تھے اس لئے وہ جلد ہی ٹھیک ہو گیا۔ مگر اس کے باپ کو پورے بیس روز بعد اسپتال سے رخصت ملی۔ دوسری بار ناکام ہونے کے بعد روشن خان تقریباً" دو ماہ تک خاموش رہا لیکن اس کے بعد اس نے پھر شیرو کو ایک روز راستے میں گھیر لیا مگر اس دفعہ بھی روشن خان کو مایوسی ہوئی۔ اس کے بعد بھی روشن خان نے شیرو کے کانٹے کو درمیان سے نکالنے کی خاطر اپنے آدمیوں کے ذریعے اس پر قاتلانہ حملے کرائے مگر ہر بار شیرو بال بال بچ گیا اور روشن خان کے آدمیوں کو زخمی ہو کر بھاگنا پڑا۔ پے در پے حملوں کے بعد ایک روز اچانک لوگوں کو معلوم ہوا کہ روشن خان نے شیرو سے دوستی کر لی ہے۔ اس نے شیرو کے ساتھ ایک بزرگ کی درگاہ پر جا کر حلف اٹھا لیا تھا کہ آئندہ وہ دونوں دوست کی حیثیت سے ملیں گے اور یہ کہ وہ پھر کبھی شیرو پر حملہ نہیں کرائے گا۔ اس روز کے بعد سے شیرو اور روشن خان اکثر ایک ساتھ بازاروں میں گھومتے پھرتے دیکھے گئے تھے ______!!

شیرو کے کردار اور اس کی شخصیت کا ایک پہلو اجاگر کر دینے کے بعد اب میں

اس پر اسرار واقعے کی طرف آتا ہوں جو ستائیس سال گزر جانے کے باوجود میرے ذہن میں آج بھی روز اول کی طرح محفوظ ہے لیکن جس کا حل آج تک میری سمجھ میں نہ آسکا۔ چونکہ سب رنگ میں اس قسم کی ناقابل توجیہہ آپ بیتیاں شائع ہوتی رہتی ہیں اس لئے اپنی اسی ذہنی الجھن کو دور کرنے کی خاطر میں یہ واقعہ آج رقم کر رہا ہوں۔ واقعات کا شاہد ہر جگہ میں خود ہوں اس لئے یقین نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

گڑھی کی سرائے میں یوں تو شیرو کو سب ہی جانتے تھے لیکن خاص طور پر میرا اور شیرو کا تعلق بہت قریبی تھا چنانچہ میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ روشن خان کو زیر کر لینے کے بعد شیرو کی دھاک شہر کے تمام بدمعاشوں پر بیٹھ چکی تھی۔ شیرو کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو یقینی طور پر غلط راستے پر پڑ جاتا۔ وہ اگر چاہتا تو شہر کے تمام اڈوں سے ہر ہفتے بڑی بڑی رقمیں وصول کر کے ٹھاٹ سے مونچھوں پر تاؤ دے سکتا تھا جیسا کہ دوسرے بڑے بدمعاش کرتے تھے لیکن شیرو کردار کا بڑا ٹھوس واقع ہوا تھا اس نے خراد کے پیشے کو اپنایا ہوا تھا اور اسی پر قناعت کرتا تھا۔ محلے کے تمام چھوٹے بڑوں کی عزت کرنا گویا اس پر فرض تھا۔ کیا مجال جو اس نے کبھی محلے کی بہو بیٹیوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھا ہو۔ رات برات اگر پڑوس میں کسی کو کوئی ضرورت پیش آ جاتی تو وہ سیدھا شیرو کے دروازے پر پہنچ کر کھٹکھٹاتا اور شیرو ماتھے پر کوئی شکن لائے بغیر اس کی دلجوئی میں لگ جاتا۔ شیرو ایک ایسا شخص تھا جس سے سب محبت کرتے تھے۔ جو لوگوں کے لئے پیدا ہوا تھا جو ایک شریف النسل اور مضبوط کردار کا نوجوان تھا۔

اس وقت شیرو کی عمر یہی کوئی ستائیس یا اٹھائیس سال رہی ہو گی۔ بے حد صحت مند اور خوبصورت نوجوان تھا وہ محلے کا محبوب تھا۔ میں محلے کی کئی ایسی لڑکیوں سے واقف تھا جو شیرو کو دیکھ کر ٹھنڈی سانسیں لیا کرتی تھیں۔ جہاں شیرو کے کام پر روانہ ہونے کا وقت ہوتا وہ لڑکیاں دروازوں پر آ کھڑی ہوتیں او جب تک شیرو گلی کی نکڑ پر پہنچ کر ان کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جاتا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتی رہتیں۔ اکثر لڑکیاں اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی خاطر آوازے بھی کس دیا کرتی تھیں لیکن شیرو

نے کبھی کسی کی طرف نظر نہیں اٹھائی تھی۔ سر جھکائے نظریں نیچی کئے خاموشی سے گزر جایا کرتا تھا۔ شام کو کام سے سیدھا گھر واپس آتا اور والدین کی خدمت میں لگ جاتا۔ میں شیرو سے زیادہ اس کے باپ سے بے تکلف تھا اس لئے ایک روز میں نے موقع پا کر پوچھ ہی لیا۔

"خان صاحب ——— آپ شیرو کی شادی کیوں نہیں کر دیتے۔ بہو آ جائے گی تو آپ لوگوں کو بھی آرام ہو جائے گا۔"

"میں کئی بار اس مسئلے پر زبان کھول چکا ہوں۔" شیرو کے باپ نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میرے سامنے تو شیرو سر جھکا کر چپ ہو جاتا ہے لیکن بعد میں شادی کے سلسلے میں انکار کر دیتا ہے۔"

"وہ کیوں ——— کیا اس نے تمام زندگی کنوارا رہنے کی قسم کھا رکھی ہے؟" میں نے پوچھا تو شیرو کا باپ زیر لب مسکرا کر بولا۔

"لڑکپن ہے ابھی ——— کہتا ہے کہ شادی کر لوں گا تو صحت کا ستیاناس ہو جائے گا۔"

شیرو کے باپ کی بات پر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی ——— ہم دونوں دیر تک شیرو کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے کرید کرید کر معلوم کرنے کی کوشش کی کہ آخر شیرو شادی کے نام سے کیوں بدکتا ہے۔ لیکن کوئی معقول وجہ نہ معلوم ہو سکی چنانچہ میں نے پھر کبھی اس سلسلے میں چھان بین کی کوشش نہیں کی۔ مجھے اس بات کا خدشہ بھی تھا کہ کہیں میرے زیادہ پوچھنے پر شیرو کا باپ یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ میں شیرو کی ذات میں اپنی لڑکی کی وجہ سے دلچسپی لے رہا ہوں۔

شیرو اور اس کے والدین کو ہمارے محلے میں آباد ہوئے کوئی دو سال گزر چکے تھے۔ روشن خان اور شہر کے دیگر بدمعاش شروع شروع میں شیرو کو کام کا آدمی سمجھ کر برابر حاضری دیتے رہے لیکن جب انہیں احساس ہوا کہ شیرو ان کی لائن کا آدمی نہیں تو سارے کے سارے ایک ایک کر کے اس سے دور ہوتے چلے گئے۔ مجھے خوشی تھی کہ شیرو نے غلط راہ اختیار کرنے کے بجائے اپنی شرافت کو برقرار رکھا۔ اس کے روز مرہ کے معمول میں مطلق کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھیں۔

شام کے وقت میں اور شیرو کا باپ باہر گلی میں بچھے تخت پر بیٹھ کر وقت گزاری کیا کرتے تھے۔ شیرو کام سے واپس لوٹتا تو گھر میں داخل ہونے سے پہلے بڑے ادب سے مجھے سلام کرتا تھا اور میں ہمیشہ اسے سچے دل سے دعائیں دیتا تھا لیکن ایک دن جب شیرو واپس لوٹا تو نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کچھ پریشان ہے۔ اس روز اس کے چہرے پر وہ بشاشت نہیں تھی جو میں دو سال سے برابر دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ بجھا بجھا سا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے تکان پر محمول کیا اور کوئی خاص توجہ نہیں دی لیکن جو بات میں نے محسوس کی وہی شیرو کے باپ نے بھی محسوس کر لی تھی۔ کچھ دیر تک ہم لوگ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر شیرو کے باپ نے شیرو کو آواز دی ——— وہ باہر آ گیا ——— اس وقت بھی اس کی آنکھوں سے ویرانی جھانک رہی تھی چہرے پر اداسی پھیلی ہوئی تھی۔ شیرو کے باپ نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات ہے بھائی، تم آج کچھ پریشان معلوم ہوتے ہو؟"

"جی خراب ہو رہا ہے۔" شیرو نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔

"کوئی خاص بات ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم ———" شیرو نے الجھے ہوئے انداز میں کہا تو اس کے باپ نے قدرے برہمی سے اسے مخاطب کیا۔

"ابے سیدھی طرح کیوں نہیں بتاتا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ کیا کسی سے دنگا فساد کر کے آیا ہے۔"

جواب میں شیرو نے باپ کی طرف گھورا پھر کوئی بات کہے بغیر تیزی سے اندر چلا گیا۔ شیرو کا طرز عمل میرے علاوہ اس کے باپ کے لئے بھی خلاف توقع تھا اس لئے وہ مجھے رکنے کے لئے کہہ کر اندر چلا گیا۔ بیس منٹ بعد واپس لوٹا تو اس کے چہرے پر بھی جھلاہٹ طاری تھی میں نے دبی زبان سے پوچھا۔

"خیریت تو ہے خان صاحب۔ آپ بھی کچھ پریشان سے نظر آ رہے ہیں۔"

"کیا بتاؤں جی، شیرو کا باپ تخت پر بیٹھتے ہوئے بولا ——— "ان عورتوں نے الٹے سیدھے قصے مشہور کر کے آجکل کے لونڈوں کو بزدل بنا دیا ہے۔ مفت کے

وہم کا علاج تم حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔"

"معاملہ کیا ہے؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

"اجی کیا خاک معاملہ ہے۔" شیرو کا باپ بولا ———— "آج سویرے جب شیرو کام پر جا رہا تھا تو بڑے چوراہے پر کچھ غلاظت پڑی تھی ———— اس وقت تو سالا اسے پھلانگ گیا اور اب بیٹھا زٹخنوں جیسی باتیں کر رہا ہے کہتا ہے کہ سویرے سے جی الٹ رہا ہے اور برے برے خیال آ رہے ہیں۔"

"کس قسم کی غلاظت تھی چوراستے پر؟" میں نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"اجی غلاظت کیسی ———— کسی نے تازے پھول اور انڈے لا کر ڈال دیئے تھے وہاں ......" شیرو کا باپ بولا۔ "کسی پنڈت پجاری نے حرکت کی ہوگی۔ لیکن شیرو کی ماں کہتی ہے کہ وہ کوئی جادو ٹونا تھا ———— لاحول ولاقوۃ ————"

"خان صاحب مگر بہتر ہے کہ آپ شیرو کو لے جا کر بڑی مسجد کے مولوی صاحب سے پھنکوالیں۔" میں نے آہستگی سے مشورہ دیا تو شیرو کا باپ مجھے تعجب خیز نظروں سے دیکھ کر بولا۔

"تو کیا آپ کا بھی یہی خیال ہے کہ انڈے اور پھول کوئی جادو ٹونا تھے۔"

"مجھے تو ان باتوں پر کبھی اعتقاد نہیں رہا لیکن اپنے بزرگوں سے میں نے بھی یہی سن رکھا ہے کہ چوراہے پر پڑی ہوئی چیزوں کو کبھی نہیں پھلانگنا چاہیے۔ ورنہ وہ جادو جو کسی اور پر کیا جاتا ہے اس شخص پر لوٹ آتا ہے جو اسے پہلے پھلانگ جائے ہندوؤں کے یہاں ایسے جادو ٹونے برابر ہوتے رہتے ہیں ———— ایک بار میرے ماموں کے لڑکے ...."

"اجی بس چھوڑیئے بھی" شیرو کے باپ نے میرا جملہ کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا۔ "سننے کو تو میں نے بھی ایسے ہزاروں توڑ جوڑ اور گنڈے تعویذ کے قصے سن رکھے ہیں لیکن یہ سب بیکار باتیں ہیں۔ نری بکواس۔"

میں نے شیرو کے باپ کے تیور دیکھ کر بڑی خوبصورتی سے بات ٹال دی اور دوسری باتوں کا سلسلہ شروع کر دیا لیکن نہ جانے کیوں میرا دل رہ رہ کر شیرو کی طرف

سے پریشان ہو رہا تھا ———— اگر میرے بس میں ہوتا تو میں شیرو کو اسی وقت کسی مولوی کے پاس لے جا کر جھاڑ پھونک کرا دیتا۔ جادو ٹونے پر انسان کا اعتقاد ہونا نہ ہونا علیحدہ بات ہے لیکن احتیاط کر لینے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے۔ بہرحال میں چاہنے کے باوجود شیرو کے سلسلے میں کچھ نہ کر سکا اور کچھ دیر بعد اٹھ کر اپنے گھر چلا گیا۔ گھر جا کر میں نے اپنی بیوی سے تذکرہ کیا تو اس نے بھی میری تائید کرتے ہوئے یہی کہا تھا کہ "خدا نہ کرے جو وہ منحوس پھول اور انڈے کسی جادو ٹونے کا اتار ہوں اور شیرو بیچارے پر کوئی ناگہانی آفت پڑے لیکن خان صاحب کو یہی چاہیئے تھا کہ کسی مولوی سے مشورہ کر لیتے ———— اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔"

رات کو کافی دیر تک میں اور میری بیوی شیرو کے بارے میں باتیں کرتے رہے پھر میں نے دوسری کروٹ لی اور سونے کے ارادے سے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا لیکن مجھے سوئے ابھی کوئی ایک گھنٹا ہی گزرا تھا کہ کسی نے میرے بازو تھام کر زور سے ہلانا شروع کر دیا۔ میں کچی نیند سے ہڑبڑا کر جاگا تو دیکھا کہ میری بیوی اور بیٹی میرے قریب موجود ہیں۔ دونوں کے چہرے دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"کیا بات ہے ———— کیا مصیبت آ پڑی ہے؟"

قبل اس کے کہ میری بیوی کوئی جواب دیتی ایک کربناک چیخ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی کسی کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ دوسرے ہی لمحے میں اچھل کر بستر سے نیچے اترا اور اپنی بیوی سے پوچھا۔

"یہ کس کی آواز تھی نیک بخت، کچھ بتا تو سہی کہ آخر کیا گڑبڑ ہے؟"

"شیرو ————" میری بیوی نے بمشکل اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ "بڑی دیر سے شیرو کی چیخ پکار کی آوازیں آ رہی ہیں سارا محلہ باہر گلی میں جمع ہے۔"

"شیرو!" میں نے بے چین ہو کر کہا ———— "کیا ہوا شیرو کو؟"

"مجھے کیا خبر کہ وہ غریب کس مصیبت میں مبتلا ہے۔ ذرا تم باہر نکل کر معلوم کرو کہ کیا معاملہ ہے؟"

میں نے سلیپر پاؤں میں ڈالے اور جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا تو دیکھا کہ محلے کے بہت سارے افراد شیرو کے گھر کے سامنے اکٹھا ہیں۔ میں گھبرایا ہوا قریب گیا۔ باہر بیٹھک میں بھی کچھ لوگ موجود تھے شیرو کا باپ دونوں ہاتھوں سے شیرو کو جکڑے ہوئے بیٹھا تھا اور شیرو پچھاڑیں کھا کھا کر اور تڑپ تڑپ کر خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں جن میں سے بڑی خوفناک وحشت جھانک رہی تھی۔ چہرے پر خفگی کے تاثرات موجود تھے۔ میں شیرو کو اس کیفیت سے دوچار دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ شیرو جس نے کبھی باپ سے نگاہیں بھی چار نہ کی تھیں۔ اس وقت باقاعدہ اس سے زور آزمائی کر رہا تھا اور دوسرے لوگوں کو آنکھیں پھاڑے یوں گھور رہا تھا جیسے وہ سب کو کچا چبا ڈالنے کا خواہشمند ہو۔ اسی بوکھلاہٹ کے عالم میں میں نے شیرو کے قریب جا کر بڑی نرم آواز میں پوچھا۔

"شیرو بیٹا ———— کیا بات ہے؟"

"تم ———— تم کون ہو؟" شیرو نے مجھے غضبناک نگاہوں سے دیکھا پھر خود کو باپ کی گرفت سے آزاد کرانے کی ناکام کوشش کرتا ہوا کسی زخمی شیر کی طرح دھاڑا ———— "تم ہنومان کی گندی آتما ہو جو منش کا روپ دھار کر مجھے ڈرانے آئی ہو۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔ نہیں تو میں تم کو بھسم کر دوں گا ———— سریتا کا پریم میری آتما کی آشا ہے۔ تم میری آشا کو مجھ سے کبھی نہیں چھین سکتے۔"

میں نے شیرو کی بدلی ہوئی آواز سنی تو میرا دل دھڑکنے لگا۔ وہ بڑی روانی کے ساتھ ہندی بول رہا تھا۔ معاً مجھے شام کی باتیں یاد آ گئیں۔ مجھے یقین آ گیا کہ شیرو کی موجودہ حالت چوراہے کے ان ہی پھولوں اور انڈوں کا نتیجہ ہے جنہیں اس نے صبح پھلانگا تھا۔ وہ سب کچھ ضرور کسی جادو ٹونے کا معاملہ تھا جو اب شیرو کے اوپر آ چکا تھا۔ ابھی میں ان باتوں پر غور کر ہی رہا تھا کہ شیرو کے باپ کی گلوگیر آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ شیرو سے کہہ رہا تھا۔

"شیرو ———— میرے بچے۔ میری طرف دیکھ میں تیرا باپ ہوں۔"

"تو میرا پتا نہیں بلکہ راکشس ہے تم سب راکھشس ہو۔ تم نے سریتا کو مجھ سے دور کر دیا ہے۔ چھوڑ دے مجھے اپرادھی۔"

شیرو نے ایک بار پھر خود کو آزاد کرانے کی جد و جہد شروع کر دی تھی۔ دو چار آدمیوں نے اسے پکڑ لیا۔ باقی لوگ حیران پریشان کھڑے سوچ رہے تھے کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ شیرو کا باپ رو رو کر خدا سے اپنے بچے کی بھلائی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ اندر سے شیرو کی بوڑھی ماں کے رونے کی دلدوز آواز آ رہی تھی۔ چند ثانئے تک میں گنگ سا کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا پھر گھر آ کر میں نے اپنی بیوی اور بچی کو شیرو کی ماں کی خبر گیری کے لئے روانہ کیا اور خود مکان کو تالا لگا کر دوڑا دوڑا بڑی مسجد کی سمت گیا اور وہاں سے پیش امام صاحب کو بمشکل تمام منت سماجت کر کے ساتھ لے آیا جو دعا تعویز کرنے کے معاملے میں خاصے مشہور تھے اور جن بھوت اتارنے کا کام بھی کیا کرتے تھے ———— میں نے راستے میں ہی انہیں شیرو کے بارے میں مختصراً بتا دیا تھا کہ معاملے کی نوعیت کیا ہے۔

پیش امام صاحب کے آتے ہی لوگوں کے چہروں پر زندگی کے تاثرات ابھر آئے۔ یکے بعد دیگرے وہ ایک طرف ہٹتے گئے اور پیش امام اپنا چغہ سنبھالے آگے بڑھتے رہے۔ شیرو کی چیخ پکار اب بھی ابھر رہی تھی۔ پیش امام صاحب نے اپنی رفتار تیز کی اور بڑے جاہ و جلال کے ساتھ اس کمرے میں قدم رکھا جہاں شیرو دو تین لوگوں کے شکنجے میں پھنسا تڑپ تڑپ کر خود کو آزاد کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

کمرے کے اندر موجود افراد نے پیش امام کو دیکھا تو وہ بھی احتراماً جھک گئے لیکن شیرو۔ وہ چیخنا چلانا چھوڑ کر پیش آمام کو گھورنے لگا تھا۔ اس کے تیور بے حد خراب نظر آ رہے تھے۔ آنکھیں اس قدر لال ہو رہی تھیں جیسے دو دہکتے ہوئے انگارے، جڑ دیئے گئے ہوں۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ کی مٹھیوں کو بار بار بڑی سختی سے بھینچ رہا تھا۔ پیش امام صاحب کچھ دیر تک شیرو سے نظریں چار کئے کچھ پڑھتے رہے پھر انہوں نے بڑے دبنگ لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"کون ہے تو؟"

"پرمود کمار" شیرو نے بدلی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو مولوی جی!"

"تو اس غریب کو کیوں پریشان کر رہا ہے۔ اس نے تیرا کیا بگاڑا ہے

——؟" پیش امام صاحب نے دوسرا سوال کیا۔

"اس نے میری آتما پاکل کی ہے۔ اسے میرے آڑے نہیں آنا چاہئے تھا۔ یہ سامنے آگیا تو میں اسی پر آگیا۔" شیرو نے خونخوار لہجے میں جواب دیا۔

"پر تو اب اسے چھوڑ دے —— جا چلا جا —— سمجھا کہ نہیں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں۔" پیش امام صاحب نے اس بار کرخت آواز میں شیرو کو مخاطب کیا۔

"اسے چھوڑ دوں۔" اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ "میں بلیدان لئے بغیر اسے چھوڑ دوں۔ مولوی اپنا کام کر، میرے راستے میں نہ آ۔ تو مجھے نہیں جانتا۔ مجھے اجودھیا والے پنڈت نے بھیجا ہے۔ میرا نام پرمود ہے۔ جا اپنا کام کر۔

شیرو کے اس انداز پر پیش امام صاحب کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ گرج کر کہنے لگے

"گستاخ —— میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ شیرو کا پیچھا چھوڑ دے نہیں تو میں تجھے جلا کر راکھ کر دوں گا۔"

"میں تمہاری آگیا کا پالن کر سکتا ہوں میاں جی۔ پرنتو اس کے لئے تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔"

"وہ کیا ——؟"

"تمہیں مجھے سریتا کے خون سے اشنان دینا ہوگا۔" شیرو نے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔ "اس کے پوتر خون سے میری آتما شانت ہو جائیگی۔"

"سریتا کون ہے؟" پیش امام صاحب نے سپاٹ لہجے میں دریافت کیا۔

"سریتا۔ میرے من مندر کی رانی، میری آشا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ بھی میرے ساتھ امر ہو جائے اور اس کا کیول ایک ہی اوپائے ہے تم اسے مار کر میری "اچھا" (خواہش) پوری کر دو۔ میں یہاں سے چلا جاؤں گا ——"

"کیا تم مجھے سریتا کا پتا بتا سکتے ہو ——؟"

"کیوں نہیں —— پرنتو تمہیں اپنے دھرماتماؤں کا سوگند کھا کر مجھے وچن دینا ہوگا کہ تم میرے ساتھ دھوکا نہیں کرو گے اور اگر کرو گے تو نقصان اٹھاؤ گے۔"

"کیا اس کے بغیر تو شیرو کا پیچھا نہیں چھوڑ سکتا۔"

"نہیں بالکل نہیں —— ایسی بات دل سے نکال دو۔"

"سیدھی طرح راہ راست پر آ جاؤ ورنہ میں تمہیں ایسی سزا دوں گا کہ تمام عمر یاد رکھو گے۔"

"مولوی —— میں کہتا ہوں یہاں سے چلے جاؤ۔" "کیوں اپنا ایمان خراب کرانا چاہتے ہو۔"

اس بار پیش امام صاحب کسی قدر جھکے اور انہوں نے نرم لہجے میں کہا "پرمود کمار تجھے جہاں کے لئے بھیجا گیا ہے وہاں چلا جا۔ شیرو کو چھوڑ دے۔ اپنا راستہ لے۔ ہمیں تجھ سے کوئی بیر نہیں۔"

"اب میں کہیں اور نہیں جا سکتا مولوی جی۔ اس نے راستے میں آ کر مجھے اپنے پاس بلا لیا ہے۔ میں تو ایک سندر ناری کے پاس جا رہا تھا۔"

"سندر ناری کے پاس —— وہ کون ہے؟" پیش امام صاحب نے پوچھا۔

"وہ یہی رہتی ہے —— بھیتر ہی ——"

—— پیش امام صاحب نے تعجب سے پوچھا۔ "اس کا نام کیا ہے؟"

"میں تمہیں کیوں بتاؤں —— شیرو نے لاپروائی سے کہا۔

بھیتر ہے —— مگر تمہیں کس نے بھیجا ہے؟"

"ایک یوک (نوجوان) نے جو اس سندر ناری کا پریمی ہے اور اس کے من میں اپنے پریم کی جوت جگانا چاہتا ہے یا اس سے انتقام لینا چاہتا ہے۔"

"اور اس یوک کا نام کیا ہے؟"

"اسے تم جانتے ہو پر میں اس کا نام نہیں بتاؤں گا۔ مولوی اب زیادہ باتیں نہ پوچھ۔ جاؤ تم یہاں سے جاؤ۔ میری آتما کو شانت کرنے کے لئے سریتا کا خون لاؤ۔ مجھے سریتا کی ضرورت ہے۔"

"پرمود کمار، میں تم سے کہتا ہوں تم سیدھے طریقے سے چلے جاؤ ورنہ میں تمہیں کہیں کا نہ رکھوں گا۔"

شیرو نے اس بار فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر سرخ

سرخ آنکھوں سے پیش امام کو گھور رہا تھا۔ کمرے میں گہرا سکوت طاری تھا۔ سب لوگوں کی نظریں شیرو پر جمی تھیں کہ اچانک اس نے ہماری غفلت سے فائدہ اٹھا کر ایک جھٹکے سے خود کو آزاد کیا پھر قبل اس کے کہ لوگ اسے دوبارہ جکڑتے وہ ایک جست لگا کر پیش امام تک پہنچ گیا اور ان کو اٹھا کر اتنی زور دار پٹخنی دی کہ بیچارے پیش امام صاحب لوٹ پوٹ کر رہ گئے۔ شیرو خطرناک تیور سے پھر ان کی جانب لپکا تھا۔ لیکن اتنی دیر میں چار پانچ آدمی اس پر ٹوٹ پڑے اور بڑی مشکلوں سے اسے قابو میں کیا گیا۔ پیش امام صاحب اپنا چغہ جھاڑتے ہوئے اٹھے۔ ان کے جاہ و جلال میں پہلے کے مقابلے میں زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ شیرو کو غضبناک نظروں سے گھور کر بولے۔

"نابکار ———— اب دیکھ کہ میں تجھے کیسی سزا دیتا ہوں۔"

پیش امام نے اتنا کہہ کر کچھ پڑھنا شروع کر دیا مجھے یقین تھا کہ اب کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ اس لئے کہ پیش امام صاحب کے بارے میں یہ بات بیشتر لوگوں کو معلوم تھی کہ بھوت پریت کا جھاڑ کرنے میں وہ دور دور مشہور ہیں۔ میری نظریں کبھی شیرو کو تکنے لگتیں اور کبھی پیش امام کے چہرے پر مرکوز ہو جاتیں۔ وہ دونوں دو بھوکے شیروں کی طرح ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ شیرو کے باپ کی حالت قابل رحم تھی۔ وہ بیچارا بڑی امید و بیم کی کیفت سے دو چار تھا۔ خاصی دیر تک ہر شخص دم بخود رہا۔ پیش امام صاحب کے ہونٹوں کی حرکت اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ وہ کسی وظیفے کا ورد کرنے میں مصروف ہیں۔ شیرو کسی چٹان کی طرح اٹل نظر آ رہا تھا۔ میری کیفیت قدرے مختلف تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے شیرو کو بس میں کر پیش امام صاحب کے لئے محال ہو گا۔ بہر حال میں بھی ایک خاموش تماشائی کی طرح سب کچھ دیکھ رہا تھا کہ اچانک پیش امام صاحب نے منہ پر ہاتھ پھیر کر ایک زور دار پھونک جو شیرو کو ماری تو وہ اس طرح زمین پر گرا جیسے کوئی درخت جڑ سے اکھڑ گیا ہو زمین پر گرتے ہی وہ ماہی بے آب کی مانند تڑپنے لگا۔ اس کے حلق سے کربناک چیخیں بلند ہو رہی تھیں لیکن وہ شیرو کی اپنی آواز نہ تھی۔

شیرو کے باپ نے شیرو کو کرب کی اس شدید کیفیت سے دو چار دیکھا تو ضبط نہ

سکا اور پیش امام صاحب کو مخاطب کر کے بولا "میاں جی ———— یہ کیا کر دیا تم نے۔ اس طرح تو میرا بچہ مر ہی جائے گا۔" لیکن پیش امام جواب دینے کے بجائے شیرو کو گھورتے رہے جو بدستور فرش پر پڑا لوٹن کبوتر ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنا سر زمین پر مارنا شروع کیا اور دوسری ہی ٹکر میں خون کی ایک لہر اس کی پیشانی سے بہہ کر چہرے تک آئی تو اس کے باپ نے دوڑ کر اسے اپنے آہنی بازووں میں جکڑ لیا۔ ٹھیک اسی وقت میاں صاحب چیخے:

"چھوڑ دو' اس مردود کو' میں اسے ابھی جہنم رسید کر دوں گا۔ علیحدہ ہٹ جاؤ۔"

میاں صاحب نے وہ جملہ یقیناً" شیرو کے باپ کو مخاطب کر کے کہا تھا لیکن اس کے بجائے شیرو نے بدلی ہوئی آواز میں جس میں کرب کی آمیزش بھی تھی کہا:۔

"میاں جی ———— میں اس سمے جا رہا ہوں پرنتو اتنا دھیان میں رکھو کہ میں شیرو کو اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک تم مجھے سریتا کے خون سے اشنان نہیں دو گے۔ اگر تم میری آتما کو شانت کرنے کا بندوبست نہ کیا تو میں اسے جان سے مار دوں گا۔"

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ کم از کم میرے لئے انتہائی تعجب خیز تھا شیرو نے ایک لمحے کے لئے اپنے باپ کے بازوؤں میں جھکولا کھایا پھر دوسرے ہی لمحے آنکھیں کھول کر سب کو یوں گھورنے لگا جیسے ان کے جمع ہونے کی وجہ جاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اب اس کی آنکھوں میں پہلی جیسی سرخی بھی نہیں تھی۔ چند ثانئے تک وہ ہکا بکا لوگوں کو گھورتا رہا پھر اپنے باپ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"کیا بات ہے ابا۔ یہ لوگ کیسے اکٹھا ہیں ———— اور ———— اور یہ میرے چہرے پر خون کیسا ہے؟؟"

تم سوتے میں چارپائی سے گر پڑے تھے۔" پیش امام صاحب نے جلدی سے کہا پھر آگے بڑھ کر شیرو کے سر پر بڑی محبت سے ہاتھ پھیرنے لگے۔ اشاروں میں انہوں نے شیرو کے باپ کو تاکید کر دی تھی کہ شیرو کو اصل بات سے آگاہ نہ کیا جائے۔ دوسرے افراد بھی پیش امام صاحب کا اشارہ پا کر خاموشی سے واپس لوٹ گئے تھے۔ میں جب تک پیش امام صاحب وہاں موجود رہے بیٹھا رہا پھر انہی کے ساتھ واپس

آگیا۔ اپنے گھر کے سامنے پہنچ کر میں نے پیش امام صاحب کو خدا حافظ کہا۔ تو وہ بڑی سنجیدگی سے بولے:۔

"شیرو کے باپ نے بڑی حماقت کا ثبوت دیا ہے۔ اگر وہ درمیان میں نہ آجاتا تو میں پرمود کے گندے وجود کو آج ہی بھسم کر دیتا اب اس کا قبضے میں آنا مشکل ہو گا۔"

"آخر یہ سب کیسے ہو گیا میاں جی۔" میں نے پوچھا۔

"چوراہے کا پھول۔" پیش امام صاحب بولے۔ "وہ پھول اور انڈے ضرور کسی جادو کا اتار تھے جسے شیرو پھلانگ گیا۔ چنانچہ وہی اثر اب اس پر ہو گیا جو کسی اور پر تھا۔"

"پھر اب کیا ہو گا؟"

"مگر وہ سندر ناری کون تھی جس پر یہ جادو کرایا جا رہا تھا اور جو ہمارے قریب رہتی ہے؟"

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن میرے خیال میں وہ اس گھر سے ملحق چھ سات گھروں کے درمیان کوئی لڑکی ہو گی ———" پیش امام نے جواب دیا۔

"پھر——— اب کیا ہو گا؟"

"اللہ مالک ہے۔" پیش امام نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا پھر مجھ سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔

رات کو میں دیر تک نہیں سو سکا۔ طرح طرح کے خیالات مجھے پریشان کر رہے تھے۔ وہ نوجوان لڑکی کون ہے جس پر جادو کیا جا رہا تھا اور جو شیرو کے گھر کے قریب ہی رہتی ہے۔ میرے پریشان ہونے کی وجہ یہ تھی کہ میں ایک نوجوان لڑکی کا باپ تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی نے میری لڑکی پر جادو کرنا چاہا ہو۔ مگر وہ کون ہو سکتا ہے۔ کون ہو سکتا ہے؟ ہمارے ارد گرد چھ سات گھروں میں تین چار سے زیادہ جوان لڑکیاں نہیں تھی ...... کہیں وہ میری بچی تو نہیں۔ میرے خدا۔ میں دیر تک جاگتا رہا اور پھر میرے ذہن میں ایک شخص ابھرا۔ خدا کرے ایسا نہ ہو۔

صبح میری آنکھ خاصی دیر سے کھلی۔ سبزی وغیرہ لانے کے بعد میں شیرو کی خیریت

دریافت کرنے گیا تو وہ بالکل بھلا چنگا نظر آ رہا تھا۔ مجھ سے بڑی خندہ پیشانی سے باتیں کرتا رہا۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھ کر واپس آیا اور کپڑے تبدیل کر کے اپنے کام پر چلا گیا شام کو واپس آکر میں نے پھر شیرو کو معمول کے مطابق پایا۔ میرا خیال تھا کہ شیرو کے سر آئی بلا ٹل گئی ہو گی لیکن میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا سورج ڈھلتے ہی شیرو پھر پرمود کمار بن کر اودھم چوکڑی مچانے لگا میں خبر پاکر بھاگا ہوا اس کے گھر گیا تو وہی رات والا سماں دیکھا۔ شیرو کا باپ اسے ہاتھوں کے حلقے میں لئے کھڑا آنسو بہا رہا تھا اور شیرو ——— وہ بار بار ایک ہی رٹ لگا رہا تھا۔

"میں سریتا کا پریمی ہوں۔ سریتا میری آشا ہے مجھے میری آشا دان کر دو نہیں تو میں شیرو کی بھینٹ لئے بنا نہیں جاؤں گا۔"

میں نے فوراً" ایک کارندے کو پیش امام صاحب کی طرف دوڑایا اور خود شیرو کی بیٹھک میں موجود رہا جہاں میرے علاوہ دو چار اور پڑوسی بھی جمع ہو گئے تھے۔ شیرو کے باپ کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی نمناک نظریں اپنے جوان بیٹے پر مرکوز تھیں اور آنسوؤں کے قطرے رخساروں سے ڈھلک ڈھلک کر زمین کی پیاس بجھا رہے تھے۔ اس کے چہرے کے تاثرات اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہے۔ شیرو کی رٹ برابر جاری تھی۔ کبھی کبھی وہ خونخوار نگاہوں سے بیٹھک میں کھڑے ہوئے افراد کو گھورنے لگتا اور واہی تباہی بکنے لگتا تھا۔ کچھ دیر تک میں خاموش کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا پھر میں نے ہمت کر کے شیرو کو آہستہ سے مخاطب کیا۔

"شیرو بیٹا۔ میری طرف دیکھو۔"

"کون شیرو بیٹا۔" شیرو نے مجھے گھورتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا "میں پرمود کمار ہوں۔ سریتا کا پریمی۔"

"اوپاپی ——— تجھے تیرے بھگوان کا واسطہ۔ میرے بچے کی جان بخش دے۔" شیرو کا باپ پھوٹ پڑا۔

"سن بڈھے۔" شیرو نے اپنی سرخ سرخ نظریں باپ کی طرف گھماتے ہوئے کھردرے لہجے میں جواب دیا۔ "اگر تجھے اپنے بچے کا جیون اتنا ہی پیارا ہے تو میری

آتما کی پیاس بجھا دے۔ سریتا کا جیون ختم کر کے اس کی آتما کو میرے حوالے کر دے کیول یہی ایک اوپائے ہے۔"

"ظالم ـــــــ ذلیل۔" شیرو کا باپ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے اندھا دھند شیرو پر گھونسے برسانے شروع کر دیئے۔ اگر دو چار آدمیوں نے اسے تھام نہ لیا ہوتا تو عین ممکن تھا کہ وہ پرمود کمار کو اپنی اولاد کے ساتھ ہی جان سے مار ڈالتا۔

ابھی یہ ہنگامہ جاری تھا کہ امام صاحب تشریف لے آئے۔ شیرو کسی بپھرے ہوئے شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا۔ لیکن جیسے ہی پیش امام صاحب کو دیکھا۔ بڑے ادب سے سلام کیا۔

"جیتے رہو۔ خوش رہو۔ اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔" پیش امام نے آگے بڑھ کر شیرو کی پیٹھ تھپکی لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ پیش امام شیرو کی کیفیت بدلتے دیکھ کر طیش میں آ گئے تھے۔ میرے علاوہ دوسرے افراد بھی ششدر تھے کہ اچانک شیرو ہوش میں کیوں کر آ گیا۔

پیش امام جانے لگے تو میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ کچھ دیر تک پیش امام گم سم رہے پھر خود ہی بولے۔

"مجھے پہلے ہی خطرہ تھا۔ اب اس پلید کا قبضے میں آنا مشکل ہے۔"

"کچھ تدبیر تو بہر حال کرنی ہے۔ شیرو کے باپ کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی۔" میں نے کہا۔

"اللہ مالک ہے۔" پیش امام صاحب نے ایک سرد آہ بھری پھر تانگا پکڑ رخصت ہو گئے۔

میں واپس آیا تو شیرو کا باپ باہر کھڑا تھا۔ پریشان پریشان سا میرے قریب آ کر بولا۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ میں تو دو دن ہی میں ہمت ہار بیٹھا ہوں۔ بھائی بتاؤ میں کیا کروں۔"

"خدا پر بھروسا رکھو ـــــــ وہ بہتر کرے گا۔" میں نے اسے تسلی دینے کی خاطر کہا۔

"وہ ٹھیک ہے .... لیکن یہ سریتا نہ جانے کون ہے۔ جس کی بلا میرے بچے

کے سر آ گئی۔"

"پیش امام صاحب کا کہنا ہے کہ وہ ہفتے عشرے میں سب ٹھیک کر دیں گے۔" میں نے شیرو کے باپ کو بہلانے کی خاطر دروغ گوئی سے کام لیا۔ شیرو کا باپ خاصی دیر تک گلی میں کھڑا مجھ سے بات چیت کرتا رہا پھر مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔

مگر ایک کیا کئی ہفتے گزر گئے۔ شیرو کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ گلی کے سارے لوگ پریشان تھے۔ خود پیش امام صاحب نے بھی بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے کہ کسی طرح پرمود کمار کو اس وقت اپنی گرفت میں لے لیں جب اس کی گندی روح شیرو کے جسم میں ہو۔ مگر انہیں ایسا کوئی موقع نہ مل سکا۔ دو روز تک وہ شیرو کے مکان میں بھی چھپے بیٹھے رہے لیکن اس عرصے میں شیرو پر ایک بار بھی دورہ نہ پڑا۔ تیسرے روز جیسے ہی پیش امام صاحب نے مکان چھوڑا شیرو پھر پرمود کمار کا شکار ہو گیا۔

پیش امام صاحب کے ناکام ہو جانے کے بعد بہت سے پہنچے ہوئے لوگوں کو بلایا گیا۔ مگر عارضی فائدوں کے سوا کچھ نہ ہو سکا۔ شیرو کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ روز بروز اور سرکش ہوتا جا رہا تھا۔ وہ غصے کے عالم میں سامنے کھڑے ہوئے کسی بھی شخص کو مارنے پیٹنے لگتا۔ گھر کے برتن توڑ دیتا۔ پڑوسیوں کے گھروں میں گھس جاتا اور انہیں خوفزدہ کرتا ـــــــ ایک پڑوسی کے گھر میں گھس کر اس نے اس کی نوجوان لڑکی کے کپڑے پھاڑ ڈالے اور اسے برہنہ حالت میں دیکھ کر خوب قہقہے لگائے۔ سارا محلہ اس سے ڈرنے لگا تھا۔ جن گھروں کے دروازے کھلے رہتے تھے وہ بند رہتے تھے اور لوگوں نے شیرو کے باپ اور اس کے آسیب زدہ بیٹے پر انگلیاں اٹھانا شروع کر دی تھیں۔ شیرو جو کبھی محلے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ لوگ اب اس کی صورت دیکھ کر کانپ جاتے تھے۔ وہ 'سریتا' سریتا پکارتا رہتا تھا اور محلے کے لوگ اسے دور سے دیکھ کر ایسے چھپ جاتے جیسے انہوں نے کسی پاگل کتے کو دیکھ لیا ہو۔

میں ایک پڑوسی کی حیثیت سے شیرو کے باپ کے غم میں برابر کا شریک تھا۔ لیکن اسے تو جیسے چپ لگ گئی تھی۔ وہ اپنے نوجوان' بہادر اور مضبوط بیٹے شیرو کی طرف

سے نا امید سا ہو گیا تھا روز نئے نئے مولوی اور پنڈتوں کو وہ بلاتا اور پرمود کمار کوئی بہت چالاک اور آسیب' پلید روح یا نہ جانے کیا بلا تھا جو بڑے بڑے مولویوں اور پنڈتوں کو چکمہ دے جاتا تھا۔ آخر پیش امام صاحب کے اصرار پر میں دہلی سے ایک صوفی شاہ دین کو اپنے ساتھ لایا۔ انہوں نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا جو اس سے پہلے مولوی اور پنڈت حضرات کر چکے تھے۔ پرمود کمار نے اس کی ہر بات کا جواب دیا۔ شاہ دین اس سے آسانی سے سوالات کرتے رہے اور وہ انہیں اطمینان سے جوابات دیتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے دونوں میں ایک زمانے سے دوستی قائم ہے۔ جب شاہ دین نے یہ پوچھا کہ یہ جادو کس نے کس پر کرایا تھا۔ تو پرمود کمار نے اسی لاپروائی سے جواب دیا کہ ایک سندر ناری کے لئے ایک یوک نے کرایا تھا۔

شاہ دین نے پیش امام کا سوال دو ہرایا" اور وہ سندر ناری کون ہے؟"

"وہ یہیں قریب رہتی ہے۔" پرمود کمار نے جواب دیا۔

"یہاں کہاں۔ صاف صاف بتاؤ ———— اس کا نام کیا ہے۔" شاہ دین نے نرمی سے پوچھا۔

"اس کا نام ———— مگر میں کیوں بتاؤں۔"

"بتا دو نا ———— پرمود کمار جی۔"

"نہیں بتاتا۔"

"تمہیں معلوم ہے میں پوچھنا جانتا ہوں۔"

"اس سے پہلے بھی بہت آ چکے ہیں اور یہی بات کہہ چکے ہیں۔" پرمود کمار نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تم نہیں بتاؤ گے۔ سیدھی طرح بات مان لو اور مجھے بتا دو۔" شاہ دین نے نرمی سے کہا۔

مگر پرمود کمار اس طرح شاہ دین کو نچاتا رہا جس طرح دوسرے لوگوں کو۔ لیکن شاہ دین نے کسی اشتعال کا مظاہرہ کئے بغیر نہ جانے وہ کون سے عمل پڑھا کہ شیرو کا جسم بری طرح کانپنے لگا۔ وہ تڑپنے اور قلابازیاں کھانے لگا۔ اس نے اپنی چیخوں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ شیرو کا باپ اپنے بیٹے کی یہ حالت بڑی مشکل سے برداشت کر رہا

تھا۔ شاہ دین اسی پرسکون انداز میں بیٹھے کوئی عمل پڑھ رہے تھے۔

"بتاتا ہوں۔ بتاتا ہوں۔" ایک دم شیرو چیخا۔ "اس کا نام مہ جبیں ہے اور یوک کا روشن خان۔ مگر مولوی جی مجھے اب چھوڑ دو۔" شیرو کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

مہ جبیں اور روشن کا نام سن کر میں نے اور شیرو کے باپ نے ایک دوسرے کی طرف حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھا۔ گویا روشن خان نے اس نیچ طریقے سے انتقام لیا تھا۔ مہ جبیں وہی لڑکی تھی جسے شیرو روشن کے نرغے سے بچا کر لایا تھا اور جس کے لئے شیرو نے روشن خان کے پورے جتھے سے لڑائی مول لے لی۔ اب بات پوری طرح سمجھ میں آ چکی تھی۔ روشن سے جب کچھ نہ بن پڑا تو اس نے یہ طریقہ اختیار کیا۔ اس طرح وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا۔ شیرو کی ابتر حالت کے باوجود ہم دونوں کا وہاں بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ شیرو کا باپ اپنے لڑکے کو چھوڑ کر میرے قریب آیا اور کہنے لگا۔ "آپ اسے دیکھیں ———— میں ابھی آتا ہوں۔"

مجھے معلوم تھا وہ کہاں جانے والا ہے۔ میں نے اسے روکنا چاہا مگر وہ نہیں رکا۔ "آنا" فانا" گھر سے غائب ہو گیا۔ ادھر شاہ دین پرمود کمار کو دھمکیاں دے رہے تھے کہ وہ شریفانہ انداز سے چلا جائے تو بہتر ہے۔ نہیں تو وہ اسے جلا کر راکھ کر دینگے۔ شاہ دین نے پرمود کمار کو سخت اذیتیں دیں۔ آخر کار پرمود کمار زیر ہو گیا۔ اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ اب یہاں نہیں آئے گا۔ کچھ دیر بعد شیرو کی حالت ٹھیک ہو گئی۔ اس کا بدن دکھ رہا تھا۔ میں نے اسے سہارا دے کر چارپائی پر لٹایا اور شاہ دین سے کہا

"حضرت ———— یہ بہت چکمہ باز بلا ہے۔ پھر واپس آ جائے گا۔"

شاہ دین نے اعتماد سے کہا "نہیں نہیں ———— اب نہیں آئے گا۔ میں ایک ہفتہ یہاں قیام کروں گا۔ دیکھتا ہوں وہ کیسے آتا ہے۔ میں نے اسے سخت سزا دی ہے۔"

شیرو تھکا ہوا تھا۔ جلد سو گیا۔ میں نے شاہ دین کے قیام کا انتظام کیا اور گھر جا کر اس کے لئے کھانے وغیرہ کا اہتمام کرایا۔ شیرو کی حالت کی وجہ سے پورے گھر کا نظام درہم برہم تھا۔ میں کام کر رہا تھا مگر شیرو کے باپ کی آمد کا منتظر تھا۔ وہ شام تک نہیں آیا تو میری پریشانی بڑھ گئی۔ میں شاہ دین اور شیرو کو چھوڑ کر اسے دیکھنے جا نہیں سکتا

تھا۔ روشن کا خیال آتے ہی میرا خون کھول کھول جاتا تھا۔ کہیں، رات گئے شیرو کا باپ اداس اور نڈھال واپس آیا۔ میں نے آتے ہی اس سے پوچھا۔ "کہاں گئے تھے؟"

روشن خان کے پاس۔ مگر وہ بدمعاش شہر چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ مین نے اسے سارے شہر میں تلاش کیا ہے۔ اگر وہ مجھے مل جاتا تو میں اس کا خون پی کر ہی واپس آتا۔"

پھر وہ شیرو کی طرف مخاطب ہوا۔ "شیرو کا کیا حال ہے۔"

میں نے شروع سے آخر تک تمام روداد۔ شاہ دین صاحب کا کمال اور پرمود کمار کی واپسی کا پورا احوال سنایا تو اس کا غصہ کسی قدر ٹھنڈا ہوا۔ اس نے سوئے ہوئے شیرو کے ماتھے کا بوسہ لیا اور مجھے گلے لپٹا کر رونے لگا۔ ہم دونوں دیر تک زار و قطار روتے رہے۔

ایک ہفتے تک شاہ دین شیرو کے ساتھ رہے۔ عملیات پڑھتے رہے۔ شیرو بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ شیرو کی صحت یابی کی خوشی میں ہم روشن خان کو بھول گئے تھے۔ شاہ دین نے ہم سے رخصت ہوتے وقت پورا یقین دلایا تھا کہ اب پرمود کمار کی جرات نہیں کہ وہ شیرو کی طرف رخ کرے۔ ہم نے شاہ دین کو تمام تر مسرتوں اور عقیدتوں کے ساتھ رخصت کیا۔ ان کی وجہ سے ہمارا شیرو ہمیں واپس مل گیا تھا۔

مگر شاہ دین کے جانے کے دو دن بعد ہی پرمود کمار پھر شیرو کے جسم پر قابض ہو گیا۔ اس بار اس کے اطوار بڑے جارحانہ اور باغیانہ تھے۔ وہ چیختا چنگھاڑتا۔ توڑ پھوڑ کرتا رہتا تھے۔ محلے والے جو شیرو کے گھر آنے جانے لگے تھے۔ اب پھر اس کے سائے سے ڈرنے لگے۔ شیرو کی اس حالت نے اس کے باپ کو بہت دل شکستہ کر دیا۔ وہ گھٹنوں میں منہ دیئے کونے میں بیٹھا روتا رہتا۔ اس گھر سے ایک خاص قسم کی رفاقت کی وجہ سے میری حالت بھی شیرو کے باپ سے مختلف نہ تھی۔ کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آتا تھا اور بیرون شہر کے تمام ملا اور پنڈت آزما لئے گئے تھے۔ مگر پرمود کمار جانے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اس کی ایک ہی رٹ تھی۔ "مجھے سرِتا چاہئے۔"

○

اسی عذاب میں دن گزر رہے تھے۔ ایک روز میں صبح کام پر جانے کے لئے گھر

سے نکلا تو شیرو کے باپ نے مجھے آواز دے کر اپنی طرف بلا لیا۔ خلاف توقع اس وقت اس کے چہرے پر ایک خاص ٹھہراؤ تھا۔ کسی سمندر کی طرح جس کے دامن میں ہزاروں طوفان پوشیدہ ہوتے ہیں۔ چند ثانیے تک وہ خلا میں تکتا رہا۔ پھر بڑی ٹھوس آواز میں مجھے مخاطب کیا۔

"رحمت علی صاحب آپ نے ہمیشہ آڑے وقت میں میرا ساتھ دیا ہے جس کے لئے میں مرتے دم تک آپ کا شکر گزار رہوں گا۔ آج میں آپ کے سامنے اپنی جھولی پھیلا کر کچھ مانگنا چاہتا ہوں۔"

"میں تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ بولو کیا بات ہے۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا تو شیرو کا باپ ایک لمحے کے لئے پھر کسی سوچ میں گم ہو گیا پھر دبی زبان میں بولا۔

"بھائی! میری التجا ہے کہ آپ شیرو کو اپنا بیٹا بنا لیں اور بچی مجھے دے دیں۔"

مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اتنی بڑی بات اس قدر آسانی سے اور ایسے حالات میں مجھ سے کہہ ڈالے گا۔ چنانچہ میں اس کی درخواست سن کر کچھ گڑبڑا سا گیا۔ ابھی میں کوئی معقول جواب سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے پھر کہا۔

"رحمت علی بھائی۔' میں آپ کے ہاتھ جوڑتا ہوں کہ میری یہ آخری التجا قبول کر لیجئے۔ اگر آپ نے مجھے مایوس کر دیا تو مجھے کبھی سکون نصیب نہیں ہو گا۔"

میں عجیب شش و پنج میں مبتلا تھا۔ بہر حال میں نے بات ٹالنے کی خاطر کہا۔

"جو کچھ تم کہہ رہے ہو میں اس پر ضرور غور کروں گا لیکن اس سے پہلے ہمیں شیرو کے لئے کچھ سوچنا ہے۔ ایسی حالت میں شادی بیاہ کے بارے میں بھلا کیسے سوچا جا سکتا ہے۔"

"مجھے یقین تھا کہ آپ یہی کہیں گے۔" اس نے تیزی سے کہا۔ "مگر میں نے شیرو کی مصیبت کا حل تلاش کر لیا ہے۔ آپ صرف اتنا وعدہ کر لیں کہ اس کے ٹھیک ہوتے ہی آپ اسے اپنی غلامی میں قبول کر لیں گے۔"

میں نے ہر چند یہی کوشش کی کہ اس وقت شیرو کے باپ کو کسی طرح ٹال دوں۔ لیکن وہ تو کسی جونک کی طرح مجھ سے چمٹ گیا تھا۔ چنانچہ میں نے دبی زبان میں اسے

تسلی دینے کی خاطر حامی بھرلی۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی تھی کہ آخر شیرو کے سلسلے میں اس نے کون سا حل تلاش کیا ہے میں نے اس ضمن میں دریافت کیا تو وہ بڑے یقین کے ساتھ بولا۔

"صاحب! اس وقت میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا لیکن شام تک سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ بھی دعا کیجئے کہ شیرو کی مصیبت ٹل جائے۔ وہ میرا ایک ہی بچہ ہے۔ اس کی خاطر تو میں اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔"

مجھے چونکہ کام پر جانے کی جلدی ہو رہی تھی۔ اس لئے میں شیرو کے باپ سے اجازت لے کر چلا گیا۔ دن بھر میں اپنے کام میں مصروف رہا۔ ایک دو بار میں نے اپنے ذہن پر زور دے کر سوچا بھی کہ آخر شیرو کی مصیبت کا حل اس کے باپ کے ہاتھ کس طرح آگیا جبکہ پیش امام صاحب بھی تھک ہار چکے تھے۔

شام کو حسب معمول جب میں نے اپنی گلی میں قدم رکھا تو نہ جانے کیوں میرا دل دھڑکنے لگا۔ کوئی غیر مرئی قوت جیسے مجھے کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ میں لمبے لمبے قدم اٹھاتا گھر پہنچا تو میری بیوی نے مجھے دیکھتے ہی پریشان لہجے میں کہا۔

"شیرو کے باپ کو پولیس گرفتار کر کے لے گئی ہے۔"

"پولیس لے گئی ہے۔ کیوں؟" میں نے بوکھلا کر سوال کیا۔

"اللہ بہتر جانے مجھے تو پڑوسن کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ اس نے کسی ہندو لڑکی کو قتل کر دیا ہے۔ شیرو اور اس کے گھر والے صبح سے پولیس چوکی گئے ہوئے ہیں۔"

بیوی کے الفاظ میرے ذہن پر بم بن کر گرے۔ میں اس سے مزید کچھ پوچھے بغیر تیزی سے باہر آیا اور تانگا پکڑ کر سیدھا کوتوالی پہنچا جہاں شیرو پہلے ہی سے موجود تھا۔ شیرو کے باپ کو آہنی سلاخوں کے پیچھے رکھا گیا تھا۔ میں کوتوالی کے ایک افسر سے جو مجھے پہلے سے جانتا تھا ملا اور اس سے درخواست کی کہ مجھے شیرو کے باپ سے دو باتیں کرنے کی اجازت دی جائے۔ بمشکل تمام میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ ایک سپاہی میرے ہمراہ کیا گیا تاکہ میں شیرو کے باپ سے کوئی راز کی بات نہ کر سکوں۔ میں دھڑکتے ہوئے دل سے آہنی سلاخوں کے قریب پہنچا تو شیرو کے باپ نے بڑے تپاک سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا۔

"بھائی! اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اس نے مجھے میرے مقصد میں کامیاب کر دیا۔ اب شیرو کی بلا ٹل گئی ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔ "آخر قصہ کیا ہے تم کس جرم کی پاداش میں دھر لئے گئے۔"

"میں نے سریتا کو قتل کر دیا ہے۔" شیرو کے باپ نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ "شیرو کے اوپر آنے والی گندی بلا کی بھینٹ اسے مل چکی ہے۔ اب وہ میرے بچے کو پریشان نہیں کرے گی۔"

میں نے شیرو کے باپ کا جواب سنا تو چکرا گیا۔ کچھ توقف کے بعد میں نے پوچھا۔

"کیا تم نے پولیس کے سامنے اقبال جرم کر لیا ہے؟"

"جرم کیسا ——— بھائی! میں نے اپنا فرض پورا کیا ہے۔" شیرو کا باپ اپنی چھاتی ٹھونک کر بولا۔ "جو سچ بات تھی وہ میں نے پولیس والوں کو بھی بتا دی۔ اب جو بھی سزا ملے میں اسے بھگتنے کو تیار ہوں۔ ایک باپ اپنے بیٹے کی زندگی کے لئے یہ معمولی کام بھی نہیں کر سکتا۔"

میں نے شیرو کے باپ کا انجام سوچا تو مجھے جھرجھری آگئی رات تک محلے والے کوتوالی کے سامنے اکٹھا رہے۔ اس کی رہائی کی ہر ممکن کوشش کی گئی لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ چنانچہ نصف رات گئے تک ہر فرد مایوس ہو کر اپنے اپنے گھر چلا گیا۔ دوسرے روز پولیس نے کیس عدالت کے سامنے پیش کر دیا۔ شیرو نے محلے والوں کے مشورے پر ایک اچھا وکیل کر لیا تھا لیکن ہماری تمام کوششوں پر پانی پھر گیا۔ شیرو کے باپ نے بھری عدالت میں اپنے جرم کا اقبال کر لیا۔ عدالت نے اسے صفائی پیش کرنے کا موقع بھی دیا لیکن وہ اپنے بیان پر کسی آہنی چٹان کی طرح اٹل رہا۔ چنانچہ عدالت نے اس کا اقراری بیان قلمبند کر لیا اور دوسری پیشی پر اسے پھانسی کا حکم سنا دیا گیا۔ شیرو کے باپ نے عدالت کا فیصلہ سنا تو اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ ابھری جیسے پھانسی کا حکم اس کے لئے کوئی بہت بڑا انعام رہا ہو۔ پولیس والے جب اسے عدالت سے باہر لائے تو اس نے آخری بار میرے چہرے کو بغور دیکھا اور کہا۔

"بھائی! ——— مجھے بھروسا ہے کہ آپ اپنا وعدہ ضرور پورا کرینگے۔"

جواب میں میری آنکھوں کے پیمانے چھلک اٹھے۔ میں نے اثبات میں گردن ہلائی پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر رونے لگا۔ شیرو اور اس کی ماں کے علاوہ دوسرے پڑوسی بھی دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔!

○

اس واقعے کو گزرے آج پورے ستائیس سال گزر چکے ہیں شیر باز خاں اب چار بچوں کا باپ ہے۔ قدرت نے اس کو کھلے ہاتھوں سے نوازا ہے۔ وہ بڑی آسودہ حال زندگی بسر کر رہا لیکن آج بھی اگر کہیں اسے چوراہے پر پڑے پھول نظر آ جاتے ہیں تو اس کا زخم تازہ ہو جاتا ہے۔ وہ بچوں کی طرح سسک سسک کر رونے لگتا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے شیرو آج بھی میری عزت اسی طرح کرتا ہے جیسے پہلے کیا کرتا تھا۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ اب وہ میری عزت پہلے سے زیادہ کرتا ہے تو شائد بے جا نہ ہو گا اور یہ سب اس لئے ہے کہ پہلے میں صرف اس کا پڑوسی تھا لیکن اب میں اس کا سسر ہوں۔

کیا اب یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ میں ہی وہ خوش قسمت انسان ہوں جس کی لڑکی کی عزت و عصمت بچانے کی خاطر ستائیس برس پہلے شیرو نے روشن خان سے ٹکر لی تھی۔ مہ جبیں میری ہی لڑکی تھی۔

○

"دیوانہ کون"

ریس کورس کے باہر لوگوں کا ہجوم سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ٹکٹ گھر پر لوگ ٹڈی دل کی مانند امڈے پڑ رہے تھے۔ ونٹر میٹنگ کی آج چوتھی ریس تھی جس میں کئی انعامی ریسیں بھی شامل تھیں اور ریس کے رسیا ان انعامات کو جیتنے کے لئے جوق در جوق ریس کلب کی سمت کھنچے چلے آ رہے تھے۔

دوپہر کے ساڑھے بارہ کا عمل تھا گرمی خاصی شدید تھی لیکن اس کے باوجود لوگوں کا ہجوم ہر لمحے بڑھتا جا رہا تھا۔ سب کے ہاتھوں میں ریس کی کتابیں موجود تھیں پہلی ریس ٹھیک ڈیڑھ بجے شروع ہونے والی تھی اس لئے لوگوں کا ہجوم جلد از جلد ٹکٹ حاصل کر کے اندر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ممبر انکلوژر کے بڑے پھاٹک کے سامنے رنگ برنگی کاروں کی قطار دور تک دکھائی دے رہی تھی۔ نئی ریس کے کارڈ نے لوگوں کے اشتیاق کو آج کچھ زیادہ ہی ابھار رکھا تھا۔ کچھ افراد ایک سمت کھڑے گھوڑوں کے انتخاب کے سلسلے میں زور دار بحث کر رہے تھے اور اپنے اپنے تجربوں سے دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ لوگ ان گھوڑوں کی ہسٹری پڑھنے میں مشغول تھے جن کی ٹپ انہیں ادھر ادھر سے حاصل ہوئی تھی۔ لوگوں کے اس ہجوم میں کچھ افراد ایسے بھی تھے جنھوں نے ممبر انکلوژر والے داخلے کے پھاٹک پر کھڑے ہوئے ایک فقیر کو گھیر رکھا تھا اور اس سے جیتنے والے گھوڑوں کے نمبر پوچھ رہے تھے۔

"دفع ہو جاؤ --------" پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس لمبی اور الجھی ہوئی داڑھی والا وہ فقیر جس کے جسم پر میل کی تہیں جمی ہوئی تھیں، ہاتھ اٹھا اٹھا کر لوگوں سے کہہ رہا تھا۔ "آج کا دن تم سب کے اوپر تباہی لائے گا۔ میری مانو تو ریس کا رخ

نہ کرو اور اپنے اپنے گھروں میں جا کر دبک رہو ———"

"بابا ——— سلور کنگ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔" ایک منچلے نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"سلور کنگ ———" بوڑھا وحشت بھری آواز میں بولا۔ "بوتل والے کو اس گھوڑے پر بڑا گھمنڈ ہو گیا ہے لیکن میری بد دعا سے آج اس کا غرور خاک میں مل جائے گا۔ پروردگار نے چاہا تو سالا سلور کنگ آج بورڈ آؤٹ ہو گا ———"

"بکتا ہے سالا ———" ہجوم میں سے کسی دل جلے کی آواز ابھری۔ "سلور کنگ کی جیت سو فیصد یقینی ہے۔"

"بابا ———" ایک دوسرا آدمی ہجوم کو چیرتا ہوا آگے آیا۔ "چوتھی ریس میں سات نمبر کے گھوڑے کے بارے میں تمہارا علم کیا کہتا ہے۔"

"کون ——— وہ تمہارا باپ سیون اپ' بوڑھا غصیلی آواز میں بولا۔ اگر وہ حرام کا تخم تین فرلانگ ہی میں نہ بیٹھ جائے تو سائیں رحمت شاہ کے بجائے بھنگی کہنا۔ آخ تھو ———"

"سائیں ——— کیا دام لوگے ایک ٹپ کا۔" ایک آدمی نے بگڑتے ہوئے تیوروں سے پوچھا۔

"چل بھاگ یہاں سے چڑی کے اٹھے ——— بڑا آیا دام دینے والا ——— سالا پلپلی۔" دیوانے فقیر نے غصے میں دو چار موٹی موٹی گالیاں بکیں تو ٹپ کا بھاؤ دریافت کرنے والا بھنا کر ہجوم میں گم ہو گیا۔

جوں جوں پہلی ریس کا وقت قریب آتا گیا' فقیر کے گرد بھیڑ چھٹتی گئی' لوگوں سے چھٹکارا ملا تو نیم دیوانے بوڑھے نے سڑک پر پڑے سگریٹ کے ایک ٹوٹے کو لپک کر اٹھا لیا۔ دو چار لمبے لمبے کش لئے پھر زمین پر بیٹھ کر اسے بجھانے کی غرض سے چٹکی میں تھام کر پوری قوت سے رگڑنے لگا۔ اس اہم کام سے فراغت پا کر وہ ممبر انکلوژر کے گیٹ کے برابر بیٹھ گیا اور اپنے سینے اور گردن سے میل کی بتیاں بنا بنا کر پھینکنے کے کام میں مشغول ہو گیا۔ کبھی کبھار وہ گھونسا تان کر ان مکھیوں کو مغلظات بکنے لگتا جو اس کے جسم کی غلاظت پر یلغار کر رہی تھیں۔

سوا بجے تک باہر کی سڑک پر محض اکا دکا آدمی رہ گئے تھے۔ ممبر انکلوژر کے پھاٹک سے اب بھی کاروں کی آمد و رفت جاری تھی۔ بوڑھا ان باتوں سے بے نیاز اپنے بے سروپا مشغلوں میں منہمک تھا اس نے سوٹ والے نوجوان پر بھی کوئی توجہ نہیں دی تھی جو بہت دیر سے پھاٹک کے قریب کھڑا اسے دلچسپ نظروں سے گھور رہا تھا اور اب اس کے بالکل قریب آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"سنو ——— بوڑھے کو مصروف پا کر نوجوان نے جو اپنے رکھ رکھاؤ اور کپڑوں کے لحاظ سے کسی بڑے خاندان کا فرد نظر آ رہا تھا' بھاری بھرکم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ "تم نے ابھی سلور کنگ کے بارے میں کچھ کہا تھا۔"

"کہا تھا پھر ——— کیا وہ سالا تمہارا باپ لگتا ہے۔" بوڑھے نے خشمگیں نگاہوں سے نوجوان کو گھورا پھر اپنی ڈاڑھی کے الجھے ہوئے بالوں میں بڑے سلیقے سے انگلیوں کے ذریعے کنگھی کرنے لگا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ سلور گنگ آج نہیں جیتے گا" نوجوان نے دوسرا سوال کیا۔

"وہ ...." بوڑھے نے اس بار بڑی جلالی کیفیت میں کہا۔ "بوتل والا جہنمی کتا اگر مر بھی جائے تب بھی سلور کنگ کو نہیں جتا سکتا ——— ڈبے میں جائے گا۔"

نوجوان ایک لمحے تک کھڑا بوڑھے مجذوب کو گھورتا رہا پھر اس نے اپنی قیمتی اور سنہری رولکس واچ پر نظر ڈالی۔ پہلی ریس چھوٹنے میں اب صرف 5 منٹ باقی تھے وہ جانے کے لئے پلٹا تو بوڑھے نے اسے آواز دے دی پھر بڑے رازدارانہ انداز میں بولا۔

"دیکھو ——— تم سلور کنگ کے بجائے دو نمبر کا گھوڑا کھیلنا ——— ونڈ مارک ——— میری دعائیں اسی کے ساتھ ہیں۔"

نوجوان کے چہرے سے الجھن کے تاثرات عیاں تھے۔ بوڑھے فقیر کی بات کا جواب دینے کے بجائے وہ تیزی سے گھوما اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا اندر چلا گیا!

○

پہلی ریس کے شروع ہوتے ہی ہجوم میں جوش و خروش کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ممبر انکلوژر میں بیٹھے ہوئے افراد اپنی اپنی دوربین آنکھوں پر جمائے دوڑتے ہوئے ٹٹوؤں کی پوزیشن دیکھ رہے تھے۔ چھ فرلانگ کی ریس میں جب گھوڑے 5 فرلانگ طے کر کے آخری فرلانگ کے سیدھے راستے پر آئے تو لوگ خوشی سے چیخ اٹھے۔

"سلور کنگ ------- وہ مارا ------- کم آن سلور کنگ۔"

لیکن پھر جیسے پورے ریس کورس پر موت کی سی خاموشی طاری ہو گئی۔ سلور کنگ نے بھاگتے بھاگتے ٹھوکر کھائی تھی' اس سے پہلے کہ اس کا سوار اسے سنبھالتا' پیچھے سے آنے والے گھوڑے "سلور کنگ" کو مات دے کر آگے نکل گئے۔ ریس ختم ہوئی تو دس دس کے بھاؤ میں کھیلا جانے والا "ونڈ مارک" پہلے نمبر پر تھا۔ سلور کنگ بورڈ آؤٹ ہو گیا پھر جب لوگوں نے "پرنس" کو جیت کا پیسہ وصول کرتے دیکھا تو اس کی قسمت پر رشک کرنے لگے۔

پرنس کا اصلی نام کیا تھا یہ بہت کم لوگ جانتے تھے لیکن ایک بات سے ہر آدمی واقف تھا کہ پرنس قسمت کا سکندر واقع ہوا ہے اس کے کھیلے ہوئے گھوڑے شاذ و نادر ہی ہارتے تھے اسی وجہ سے لوگ اسے "پرنس آف دی ریس ٹریک" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ گزشتہ چار مہینوں کے اندر اس نے بک میکروں کا دیوالیہ نکال دیا تھا۔ ریس کے کرتا دھرتا بھی پرنس کی جیت سے متفکر ہو گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پرنس اگر اسی انداز میں مسلسل جیتتا رہا تو ایک دن ریس کلب بھی دیوالیہ ہو کر رہ جائے گا۔ پرنس کو دیوانگی کی حد تک ریس کھیلنے کا شوق تھا۔ وہ آنکھ بند کر کے بڑی بڑی رقمیں کھیلنے کا عادی تھا۔

○

بوڑھے فقیر نے نوجوان پرنس کو اپنے قریب بیٹھتے دیکھا تو ایک قہقہہ لگا کر بولا۔

"کیوں بیٹا ------- سلور کنگ سالا ہو گیا نا تیل' ٹائیں ٹائیں فش۔"

"تم نے درست کہا تھا سائیں بابا۔" پرنس کا لہجہ خوشامدی تھا۔ "دوسری ریس میں چار نمبر والے "بلیو کوئین" کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔"

"ہشت۔" بوڑھے نے اپنے بھدے ہونٹوں کو دائرے کی شکل دے کر حقارت سے کہا' پھر گردن پر جمے میل کو اتارتے ہوئے بولا۔ "میری دعائیں آٹھ نمبر کے "علی بابا" کے ساتھ ہیں۔ بس چلو اب دفع ہو جاؤ۔"

پرنس تیزی سے اٹھ کر اندر آیا۔ علی بابا کے بارے میں وہ بڑی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔ علی بابا کا سابقہ ریکارڈ کچھ اچھا نہ تھا۔ گزشتہ تین ہفتوں سے وہ برابر اپنی کلاس گراتا رہا تھا۔ پرنس نے اپنے سیکرٹری سے مشورہ کیا تو وہ علی بابا کے حق میں نہیں تھا۔ ریس شروع ہونے سے پہلے بھاؤ کھلے تو "بلیو کوئین" برابر کے بھاؤ میں تھا اور علی بابا پچیس کے بھاؤ میں کھیلا جا رہا تھا۔ پرنس خاموش کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ ریس شروع ہونے میں جب ایک منٹ باقی رہ گیا تو اس نے اپنے سیکرٹری کے کان میں سرگوشی کی۔

"علی بابا پر تیس ہزار لگا دو۔"

سیکرٹری نے پرنس کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا پھر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا ہوا بک میکر کی طرف بڑھا اور تیس ہزار کی رقم علی بابا پر لگا دی۔ اسے یقین تھا کہ علی بابا اپنے دوسرے حریفوں سے بری طرح مار کھائے گا۔ ریس شروع ہوئی تو علی بابا پہلے نمبر پر آیا۔ ہجوم کے چہروں پر علی بابا کی جیت سے مردنی چھا گئی لیکن پرنس خوشی سے اچھل رہا تھا۔ صرف علی بابا پر اس نے ساڑھے سات لاکھ روپے جیتے تھے۔ "ونڈ مارک" کی جیت علیحدہ تھی۔

تیسری ریس میں بھی پاگل فقیر کا بتایا ہوا گھوڑا جسے لوگ نظر انداز کر گئے تھے' بڑے شاندار طریقے سے جیتا۔ چوتھی ریس میں لوگ "سیون اپ" پر آنکھ بند کر کے بڑی بڑی رقمیں لگا رہے تھے۔ "سیون اپ" آج کی تمام ریسوں میں سب سے زیادہ فیورٹ تھا لیکن اس کا انجام بھی وہی ہوا جو بوڑھے نے بتایا تھا۔ تین فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے سے پیشتر ہی وہ بھڑک کر ریلنگ سے ٹکرا گیا اس کا سوار بری طرح زخمی ہوا تھا۔ لوگوں نے احتجاج کیا تو "سیون اپ" کو لنگڑا ہو جانے کی وجہ سے سب کے سامنے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا لیکن پرنس کو "سیون اپ" کی موت پر کوئی ملال نہیں ہوا۔ اس نے سائیں بابا کے حکم پر آٹھ آٹھ کے بھاؤ میں "رائل ہاک" کھیلا تھا جو

خلاف توقع فوٹو فنش میں جیت گیا تھا۔

ساتویں ریس کے اختتام کے بعد پرنس نے حساب لگایا تو وہ اب تک تقریباً ساٹھ لاکھ سے اوپر جیت چکا تھا۔ آٹھویں ریس شروع ہوئی تو اس نے حسب سابق اپنی جیتی ہوئی رقم مع اصل کے بوڑھے کے بتائے ہوئے گھوڑے پر لگا دی جو پندرہ کے بھاؤ کا تھا۔ نتیجہ اس بار بھی خاطر خواہ نکلا ریس ختم ہوئی تو ایک طرف پرنس خوشی کے مارے اچھل رہا تھا اور دوسری طرف سارے ہجوم پر موت کا سا سناٹا طاری تھا۔ بک میکروں کی حالت واقعی قابل رحم تھی۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ گیارہ بک میکروں میں سے چھ تو پانچویں ریس کے بعد ہی اپنا اپنا بوریا بستر لپیٹ کر جا چکے تھے آٹھویں ریس ختم ہوئی تو مزید تین ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ اب صرف دو بک میکر باقی رہ گئے تھے جن میں سے ایک ریس کلب کے سیکرٹری کا عزیز تھا۔ ہر چند کہ اس کے چہرے سے بھی وحشت برس رہی تھی لیکن وہ ابھی تک کھیلنے والوں کے مقابلے پر ڈٹا ہوا تھا۔

نویں ریس میں بوڑھے نے بڑی منت سماجت کے بعد پرنس کو "ہاٹ ویدر" کی ٹپ دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دس بارہ گالیاں بھی سنا دیں، لیکن پرنس جو بوڑھے فقیر کو مجذوب سمجھ رہا تھا مسکراتا ہوا چلا گیا۔ آٹھویں ریس کے ختم ہوتے ہی اس نے سیکرٹری کے ذریعے ستر لاکھ کی وہ رقم بھی گھر سے منگوا لی جو وہ اب تک ریس کلب سے جیت چکا تھا۔

نویں ریس شروع ہوئی تو پرنس نے اپنی تمام جیت اور اصل کے علاوہ مزید ستر لاکھ روپے بھی داؤ پر لگا دیئے۔ اسے یقین تھا کہ آج وہ اربوں کے حساب سے جیتے گا۔ ممبر انکلوژر میں اپنی مخصوص سیٹ پر بڑے اطمینان سے بیٹھا وہ دوربین کے ذریعے ریس کا جائزہ لے رہا تھا۔ آٹھ فرلانگ کی اس ریس میں دوڑنے والے گھوڑے چار فرلانگ کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ "ہاٹ ویدر" اب تک دوسری پوزیشن لئے ہوئے تھا۔ پانچویں فرلانگ پر وہ اول نمبر گھوڑے کے برابر آ گیا۔ پرنس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں پھر جب چھٹے فرلانگ پر "ہاٹ ویدر" آگے نکلا تو پرنس چیختا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"کم آن! ہاٹ ویدر ------- ون دی ریس۔"

ساتویں فرلانگ تک "ہاٹ ویدر" آگے آگے رہا لیکن پھر اچانک دوسرے نمبر کے گھوڑے کے جاکی نے بیت سنبھالی اور پلک جھپکتے میں "ہاٹ ویدر" کو پیچھے چھوڑ گیا۔ ریس ختم ہوئی تو "ہاٹ ویدر" دوسرے نمبر پر آیا۔ پرنس کو اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دیر تک وہ سکتے کی حالت میں کھڑا بورڈ پر جیتنے والے گھوڑوں کے نمبر دیکھتا رہا، پھر دیوانوں کی طرح چیخنے لگا۔

"یہ سراسر دھاندلی ہے۔ جیتنے والے جاکی نے پے در پے چابک مار کر گھوڑا جتایا ہے جو خلاف قانون ہے۔ میں احتجاج کرتا ہوں۔"

لوگ پرنس کو حیرت سے دیکھ رہے تھے جو چیختا چلاتا پیڈک کی طرف دوڑ رہا تھا۔ "ہاٹ ویدر" کے مالک سے مل کر اس نے جیتنے والے گھوڑے کے خلاف احتجاج کرایا تو لوگوں کے چہرے اتر گئے۔ وہ ججوں کے فیصلے کے منتظر تھے۔ ان کی نگاہیں اس سرخ سگنل پر جمی ہوئی تھیں جو احتجاج ہونے کے بعد نتیجے کے بورڈ کے قریب روشن کر دیا گیا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، ہجوم میں سراسیمگی بڑھتی جا رہی تھی، پرنس بار بار حلق پھاڑ کر چلا رہا تھا۔

"جیتنے والے جاکی نے دھاندلی کی ہے۔ اسے بند کرو۔"

بیس منٹ تک سارا ہجوم اپنے دل کی دھڑکنوں کو گنتا رہا۔ پھر جب مائیکرو فون کے ذریعے احتجاج رد ہونے کا فیصلہ سنایا گیا تو ہجوم خوشی سے چیخ اٹھا۔ پرنس سر تھام کر رہ گیا۔ پچھتر لاکھ کی رقم ہار جانے کے بعد وہ غصے میں پیچ و تاب کھاتا باہر نکلا تو تلاش و بسیار کے باوجود بوڑھے مجذوب کو نہ پا سکا۔ آخر تھک ہار کر وہ اپنی رولس رائس میں بیٹھا اور گھر کے لئے روانہ ہو گیا۔

دوسری صبح پرنس کو ایک ٹائپ شدہ خط موصول ہوا خط کا مضمون مختصر مگر معنی خیز تھا۔ پرنس نے دھڑکتے دل سے خط پڑھنا شروع کیا۔

محترم پرنس

"مجھے سخت افسوس ہے کہ کل ریس میں آپ پچھتر لاکھ کی رقم گنوا بیٹھے۔ بہر حال میں اس سلسلے میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے کوئی پہنچا ہوا مجذوب

سمجھ کر صرف میرے بتائے ہوئے گھوڑوں پر داؤ لگایا۔ آٹھ ریسوں میں آپ متواتر جیتتے رہے لیکن نویں ریس نے آپ کو تباہی کے غار میں دھکیل دیا۔ میں بڑی معذرت کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ آپ کی مسلسل جیت نے ریس کلب کے استحکام کو خطرے میں ڈال دیا تھا چنانچہ مجھے نوٹس مل گیا تھا کہ میں اپنے لئے کوئی دوسری ملازمت تلاش کر لوں ——— لیکن اب ریس کلب کے بند ہونے کا خطرہ ٹل چکا ہے۔ میری شاندار اسکیم اور اداکاری سے خوش ہو کر کلب کے چیرمین نے نہ صرف یہ کہ نوٹس واپس لے لیا ہے بلکہ میری تنخواہ میں بھی خاطر خواہ اضافہ کر دیا ہے جس کے لئے میں تہہ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

پرنس نے ہونٹ چباتے ہوئے آخری سطر پر نظر ڈالی جہاں ریس کلب کے سیکرٹری کے نام کے حروف بھی ٹائپ کئے ہوئے تھے۔



آسیبی گدھ

"خبردار .... ہوشیار .... ہوشیار ...."

محکمے کے نئے چوکیدار فضلو کی وزنی اور پاٹ دار آواز تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد رات کی تاریکی اور ماحول پر طاری سناٹے کا سینہ چیرتی ہوئی ابھرتی پھر معدوم ہوتی چلی جاتی۔

جارج ٹاؤن کا یہ علاقہ جو شہر سے تقریباً" آٹھ نو میل دور واقع تھا زیادہ تر خوبصورت بنگلوں اور عالیشان کوٹھیوں پر مشتمل تھا۔ ان کوٹھیوں میں یا تو شہر کے وہ رئیس آباد تھے جو کاروبار پیشہ تھے یا پھر اعلیٰ افسران تھے۔ جارج ٹاؤن کے اس حسین علاقے کو وجود میں آئے پندرہ بیس سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس علاقے کے افراد کو ہر قسم کی آسائشیں مہیا تھیں چونکہ یہ امیروں کی بستی تھی اس لئے یہاں پولیس کا بھی خاصا معقول انتظام تھا۔

شروع شروع میں جارج ٹاؤن کے علاقے میں مکمل امن اور سکون رہا لیکن ادھر چند مہینوں سے کچھ ایسی عجیب و غریب اور پر اسرار قسم کی وارداتیں رونما ہو رہی تھیں جنہوں نے یہاں کے رہنے والوں میں بے چینی پھیلا دی تھی۔ پولیس کا عملہ بھی آئے دن پیش آنے والے پر اسرار واقعات کے اس حیرت انگیز معمے کو حل کرنے سے قاصر رہا تھا۔

پولیس کے گرد آلود ریکارڈ کو جھاڑ پونچھ کر اگر جارج ٹاؤن کی فائل نکالی جائے اور اس کی ورق گردانی کی جائے تو معلوم ہو گا کہ پر اسرار واقعات کا یہ سلسلہ 1928ء سے شروع ہوتا ہے۔ فائل میں وہ تمام واقعات بڑی تفصیل کے ساتھ درج ہیں جن کا حل تلاش کرنے میں پولیس کے اعلیٰ دماغ اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے

وقت صفر سے آگے نہیں بڑھ سکے تھے۔ اسی فائل میں آپ کو اخبار کے وہ تراشے بھی کہیں کہیں نظر آ جائیں گے جو جارج ٹاؤن کے پر اسرار اور حیرت انگیز واقعات سے متعلق اکثر منظر عام پر آتے رہے تھے۔

پولیس فائل کے مطابق پہلا واقعہ 21 فروری کو پیش آیا تھا۔ تفصیلات سے پتا چلتا ہے کہ وہ آخری جاڑوں کی ایک سرد اور کہر آلود رات تھی۔ صبح کے کوئی تین ساڑھے تین بجے کا عمل رہا ہو گا۔ کہر کی چادر اس قدر دبیز تھی کہ آٹھ دس فٹ کے فاصلے کی چیز بھی دیکھنی مشکل تھی۔ بجلی کے کھمبوں کے ٹمٹماتے بلب کہر میں ڈوبے یوں نظر آ رہے تھے جیسے آسیبی نظریں اپنے کسی شکار کو نیم وا نگاہوں سے دیکھ رہی ہوں ملحقہ تھانے کا ایک افسر سارجنٹ بیلے اس وقت بھی دو کانسٹیلوں کے ساتھ علاقے کے گشت پر تھا۔ تیسری شاہراہ کے ایک میڈیکل اسٹور کے سامنے پہنچ کر وہ یک لخت چونک پڑا۔ اس کی نظریں سڑک پر کہر کی دبیز چادر کے درمیان ایک متحرک انسانی ہیولے پر جم کر رہ گئیں۔ سارجنٹ بیلے کے ساتھ دونوں پولیس والوں نے بھی اس شخص کو دیکھا جو گہرے سیاہ رنگ کے انتہائی شکستہ اور پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس تھا۔ غالباً" اس کے سیاہ لباس ہی نے سارجنٹ بیلے کو چونکنے پر مجبور کیا تھا۔ کہر کی وجہ سے وہ اس متحرک انسانی ہیولے کا چہرہ بخوبی نہ دیکھ سکا تھا لیکن جارج ٹاؤن کے علاقے میں صبح کے تین بجے پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس کسی شخص کو یوں تنہا پیدل سڑک پر چہل قدمی کرتے دیکھ کر وہ اس کی طرف سے مشکوک ہوئے بغیر بھی نہ رہ سکا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے کرخت آواز میں کہا۔ "اے -------- رک جاؤ ....کون ہو تم۔"

جواب میں متحرک انسانی ہیولا ایک لمحے کے لئے رکا پھر فضا میں ایک ایسے قہقہے کی پر زور آواز گونجی جیسے کسی تانبے کے برتن میں شیشے کی بے شمار گولیاں بھر کر اسے زور زور سے ہلایا جا رہا ہو سارجنٹ بیلے بیحد سخت جان اور دلیر افسر شمار کیا جاتا تھا۔ لیکن اس وقت قہقہے کی بھیانک آواز سن کر وہ بھی کچھ خوفزدہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ گشت کرنے والے دونوں کانسٹیبل نہ جانے کیوں بری طرح خائف ہو کر آگے بڑھنے کے بجائے دو قدم پیچھے ہٹ گئے تھے۔ "کون ہو تم --------" سارجنٹ بیلے نے قہقہہ لگانے والے کو دوبارہ کرخت آواز میں للکارا پھر حفظ ماتقدم کے طور پر اس نے اپنا اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور ہولسٹر سے نکالتے ہوئے بڑے سرد لہجے میں کہا -------- "میرے سوال کا جواب دو ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔"

قہقہے کی بھیانک آواز یک لخت رک گئی پھر سیاہ کپڑوں والا تیزی سے بھاگتا ہوا کہر کی دبیز چادر میں روپوش ہو گیا۔ صرف اس کے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ "میں کہتا ہوں رک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔ تم فرار نہیں ہو سکو گے۔" سارجنٹ بیلے کرخت آواز میں چلایا پھر بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز کے تعاقب میں دوڑنے لگا۔ دل ہی دل میں اس نے موسم کی ستم ظریفی کو لا تعداد گالیاں دے ڈالیں جس نے ایک ہاتھ آئے ہوئے مشتبہ شخص کو اس کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ انداز سے بھاگتے قدموں کا تعاقب کر رہا تھا۔

"تم میری نظروں میں آ چکے ہو -------- رک جاؤ فوراً" -------- ورنہ میں شوٹ کر رہا ہوں" ایک بار پھر سارجنٹ بیلے نے ہوشمندی سے کام لیتے ہوئے سخت لہجے میں کہا پھر دوسری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ جھلا گیا۔ اس خیال سے کہ ممکن ہے بھاگتا ہوا شخص اس کی باتوں کو محض دھمکی سمجھ رہا ہو اس نے یکے بعد دیگرے دو ہوائی فائر کر دیئے لیکن پھر اچانک وہ خود ہی بھیانک انداز میں چیختا ہوا منہ کے بل سڑک پر گرا۔ اس کے ڈوبتے ہوئے ذہن نے کسی بڑے پرندے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنی پھر وہ بیہوش ہو گیا تھا۔

صبح ہوش آنے پر اس نے جو بیان دیا وہ بڑا حیرت انگیز تھا۔ سارجنٹ بیلے کے بیان کے مطابق جب اس نے ہوائی فائر کیا تھا ٹھیک اسی وقت کسی پرندے نے اس کے چہرے پر جھپٹا مارا تھا پھر کریہہ آواز میں چیختا ہوا اڑ گیا۔ بیہوش ہونے سے قبل اس نے وزنی پروں کی پھڑپھڑاہٹ کو سنا تھا پھر اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔ ممکن تھا سارجنٹ بیلے کے اس بیان کو اس کی اعصابی تھکاوٹ پر محمول کر کے نظر انداز کر دیا ہو۔ اس لئے وہ گزشتہ چوبیس گھنٹوں سے مستقل ڈیوٹی دے رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر موجود گہری خراشوں نے اس کے بیان کی تصدیق کر دی تھی۔ دوسرا ثبوت ان دو کانسٹیبلوں کا بیان تھا جو سارجنٹ کے ساتھ گشت پر تھے۔

پولیس کے ریکارڈ کے مطابق پندرہ روز تک اس حادثے کی بھرپور چھان بین کی گئی پھر کوئی سراغ نہ ملنے کی وجہ سے اسے داخل دفتر کر دیا گیا۔

دوسرا واقعہ 22 مارچ کو پیش آیا۔ پولیس رپورٹ کے مطابق اس روز رات کے تقریباً" ڈیڑھ بجے جارج ٹاؤن کا تھانہ انچارج انسپکٹر خان جو اپنی اعلیٰ کار کردگی کے سلسلے میں کئی پولیس ایوارڈ حاصل کر چکا تھا اپنے ایک ماتحت سارجنٹ پرکاش کے ساتھ علاقے کے راؤنڈ پر نکلا تھا۔ انسپکٹر خان کا معمول تھا کہ وہ رات کے کسی حصے میں اچانک تھانے پہنچ کر نہ صرف یہ کہ رات کی ڈیوٹی والوں کو چیک کیا کرتا تھا بلکہ اپنی جیپ پر کسی ماتحت کے ساتھ پورے علاقے کا ایک راؤنڈ بھی ضرور لیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا عملہ ہمیشہ بہت چاق و چوبند رہا کرتا تھا۔

تھانے کے وسیع احاطے سے باہر آ کر اس نے جیپ کے ڈرائیور کو اپنے گشتی پروگرام کا نقشہ سمجھایا اور پچھلی سیٹ پر سارجنٹ کے ساتھ بیٹھ کر اس سے گفتگو میں مصروف ہو گیا۔ شروع گرمیوں کی وہ رات بیحد خوشگوار تھی۔ سترھویں رات کا چاند آسمان پر چمک رہا تھا جس کی روشنی نے پورے ماحول کو اجاگر کیا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بڑے ہی فرحت بخش محسوس ہو رہے تھے۔ کشادہ مگر سنسان سڑک پر کبھی کبھار کسی آوارہ کتے کے بھونکنے کی آواز ابھرتی اور ہوا کے دوش پر دور تک لہراتی چلی جاتی۔ پولیس جیپ' انسپکٹر خان کے بتائے ہوئے راستوں پر دوڑ رہی تھی۔ انسپکٹر خان بڑے مہذب انداز میں سارجنٹ پرکاش سے گفتگو کر رہا تھا۔ حسب معمول اس وقت بھی اس کے پتلے پتلے ہونٹوں کے درمیان چرچل برانڈ کا مخصوص اور قیمتی سگار دبا ہوا تھا جس کے ہلکے ہلکے کش وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد لے رہا تھا۔

"سارجنٹ پرکاش ------- کیا رات کو گشت کے دوران آپ کو کبھی کسی ایسے حادثے سے دوچار نہیں ہونا پڑا جس حادثے سے سارجنٹ بیلے دوچار ہوا تھا۔"

انسپکٹر خان نے سگار کا ایک ہلکا کش لیتے ہوئے ازراہ مذاق اپنے ماتحت سے پوچھا۔

"سر ------ وہ واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بیحد پر اسرار تھا۔" سارجنٹ پرکاش نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ "اگر اس رات گہری کہر مسٹر بیلے کے راستے میں حائل نہ ہوتی تو وہ یقیناً" اس شخص کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاتا

جو موقع سے فائدہ اٹھا کر بھاگ نکلا تھا۔"

"لیکن ان خراشوں کے بارے میں آپ کیا جواز پیش کریں گے جو آج بھی سارجنٹ بیلے کے چہرے پر موجود ہیں۔"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا سر ------- خاص طور پر کسی پرندے کا اتنی رات گئے کسی انسان پر یوں حملہ آور ہونا بھی عجیب سی بات ہے۔"

انسپکٹر خان نے مسکراتی ہوئی شوخ نظروں سے اپنے ماتحت کو دیکھا پھر شاید وہ کوئی دوسری بات کہنا چاہتا تھا کہ جیپ ایک موڑ پر گھومتے ہی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ انسپکٹر خان کا سگار اس کے ہونٹوں کے درمیان سے نکل کر نیچے گر پڑا سارجنٹ پرکاش نے جو انسپکٹر کی موجودگی میں سیدھا بیٹھا تھا اگر پھرتی سے اگلی سیٹ کو نہ تھام لیا ہوتا تو وہ یقیناً" اچھل کر ڈرائیور سے ٹکرا گیا ہوتا۔

"یہ کیا بیہودگی ہے۔" انسپکٹر خان نے سخت لہجے میں ڈرائیور سے دریافت کیا۔

"سس .... سر........ سڑک پر کوئی لاش پڑی ہے۔" ڈرائیور جو بذات خود اس اچانک افتاد سے بوکھلا گیا تھا جلدی سے بولا۔

لاش کا نام سنتے ہی انسپکٹر خان کا غصہ یکدم کافور ہو گیا۔ تیزی کے ساتھ وہ جیپ سے اتر کر سڑک پر آ گیا۔ سارجنٹ پرکاش نے بھی خاصی پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ ڈرائیور کا بیان غلط نہیں تھا۔ جیپ کے اگلے پہیوں سے تقریباً" پانچ فٹ کے فاصلے پر ایک شخص اوندھے منہ زمین پر پڑا تھا۔ سڑک پر جمے ہوئے خون کے لوتھڑوں پر نظر پڑتے ہی انسپکٹر خان نے لپک کر اس کی نبض کو دیکھ پھر اپنی کیپ اتار کر ڈرائیور کو تھما دی۔ اس کا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ سڑک پر اوندھے منہ پڑے ہوئے شخص کا جسم برف کی طرح سرد ہو کر اکڑ چکا تھا۔ کچھ دیر انسپکٹر خان لاش کے قریب پائے جانے والے متوقع نشانات کو دیکھتا رہا پھر جب اس نے لاش کو بازو سے پکڑ کر سیدھا کیا تو اس کے سارے جسم میں جھرجھری آ گئی۔ سارجنٹ پرکاش کی آنکھیں بھی حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

مقتول کا چہرہ بری طرح مسخ ہو چکا تھا۔ ماتھے اور شانوں پر ایسی گہری خراشیں موجود تھیں جیسے قاتل نے کسی تیز دھار آلے سے اس کے جسم کو کدو کش کرنے کی

کوشش کی ہو۔ مقتول کی سفید قمیض تار تار نظر آ رہی تھی۔ اس کے گلے میں بندھی ہوئی ٹائی کی گرہ اس قدر تنگ ہو گئی تھی کہ ایک نیلی لکیر بہت واضح طور پر ابھر آئی تھی۔

انسپکٹر خان حیرت بھری نظروں سے مقتول کے کچلے ہوئے جسم کو دیکھتا رہا پھر اس کی نگاہ مقتول کے بائیں ہاتھ کی بند مٹھی پر جم کر رہ گئی جس میں ایک سیاہ رنگ کا لمبا اور خون آلود پر پھنسا ہوا تھا۔

بعد کی تفتیش سے صرف اتنا ہی پتا چل سکا کہ مقتول کا نام رام دیال تھا۔ وہ ایک بیمہ کمپنی کا مینیجر تھا اور جارج ٹاؤن کی تیسری شاہراہ پر گیارہ نمبر کی کوٹھی میں کرائے پر رہتا تھا۔ اپنی موت سے صرف دو روز قبل اس نے اپنی بیوی بچوں کو بنارس بھیج دیا تھا۔ مقتول کی جیب سے جو چیزیں برآمد ہوئیں ان میں تقریباً" ساڑھے تین سو روپے کے کرنسی نوٹ بھی تھے۔ رام دیال کے ایک پڑوسی نے پولیس کو مقتول کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ بیحد نیک اور ملنسار لوگوں میں سے تھا اور کبھی کسی کے ساتھ جھگڑا فساد نہیں کرتا تھا۔ مقتول کے ایک قریبی دوست امرناتھ نے انسپکٹر خان کو اپنے بیان میں یہ بتایا کہ وقوعے والے روز وہ اور رام دیال ایک میوزک پارٹی میں تقریباً" ساڑھے بارہ بجے رات تک ایک ساتھ رہے تھے۔ واپسی پر امرناتھ نے اسے اپنی کار میں گھر تک چھوڑنے کی پیشکش کی تھی جسے اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ چونکہ اس کا گھر زیادہ دور نہیں ہے اس لئے وہ ٹہلتا ہوا چلا جائیگا۔

انسپکٹر خان بیس روز تک سرگرم تفتیش رہا لیکن کوئی ایسا سراغ نہ پا سکا جس کی بنا پر وہ قتل کی وجہ دریافت کر سکتا یا قاتل کو گرفتار کر سکتا۔ رام دیال کی بیوہ نے دوسرے ہی روز آلہ آباد پہنچ کر اپنے بدنصیب پتی کے کریا کرم میں شرکت کی لیکن وہ بھی کوئی ایسی بات بتانے سے قاصر رہی جو پولیس کو قاتل تک پہنچنے میں کوئی مدد فراہم کر سکتی۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ میں جو باتیں درج تھیں وہ انسپکٹر خان کے لئے غیر متوقع نہیں تھیں۔ لیکن ایک بات جو اسے بری طرح الجھا رہی تھی وہ سیاہ رنگ کا وہی لمبا پر تھا جو اسے مقتول کی بند مٹھی میں پھنسا ہوا ملا تھا۔ ماہرین کی رپورٹ نے اس پر کو

کسی ایسے گدھ کا قرار دیا تھا جسے مرے ہوئے ایک سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔

پولیس فائل میں دوسرے واقعے کے بارے میں صرف یہیں تک درج ہے۔ رپورٹ والے شیٹ پر دائیں جانب والے حاشیے میں سرخ روشنائی سے علاقے کے ڈپٹی سپرٹنڈنٹ نے جو احکام درج کئے تھے وہ صرف اتنے تھے کہ ------ " رات کو گشت کرنے والے اسٹاف میں دوگنا اضافہ فوری طور پر کر دیا جائے۔"

تیسرا واقعہ 20 اپریل کو ------ رات گئے جارج ٹاؤن کی ساتویں شاہراہ پر پیش آیا۔ اس حادثے کی چشم دید گواہ مقتول کی بیوی تھی جو حادثے کے وقت اپنے شوہر کے ساتھ موجود تھی۔ مقتول کی بیوہ نے جو تحریری بیان پولیس کو دیا وہ انتہائی پراسرار، حیرت انگیز اور ہولناک تھا۔ اپنے بیان میں اس نے لکھا تھا------

"20 اپریل کی منحوس رات کے ساڑھے بارہ کا عمل ہو گا جب میں اپنے شوہر کے ساتھ ریجنٹ سنیما سے ایک انگریزی فلم کا سیکنڈ شو دیکھ کر واپس آ رہی تھی۔ میرے شوہر کو اس روز روئی کا بھاؤ اچانک چڑھ جانے سے اپنے بزنس میں خاصا منافع ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ بہت زیادہ خوش تھے۔ ہم دونوں اپنی کار میں بیٹھے واپس گھر آ رہے تھے۔ لیکن ساتویں شاہراہ پر پہنچ کر میرے شوہر کو گاڑی کی رفتار کم کر دینی پڑی۔ اس کی وجہ وہ آدمی تھا جو سڑک کے بیچوں و بیچ کھڑا تھا۔ کسی انجانے اور ان دیکھے خطرے کے تحت میں نے اپنے شوہر سے کہا تھا کہ وہ کار روکنے کے بجائے تیزی سے آگے نکال لے جائیں مگر انہوں نے غالباً" اسے کوئی ضرورت مند راہگیر سمجھ کر رفتار کم کر لی تھی۔ جوں جوں اس آدمی کا ہماری گاڑی سے درمیانی فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ میری چھٹی حس کسی آنے والے خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ پھر جب یہ فاصلہ بمشکل تیس فٹ رہ گیا تو مارے دہشت کے میرے حلق سے چیخ نکل پڑی۔ اس وقت میرے شوہر نے سڑک کے درمیان کھڑے ہوئے شخص پر پوری لائٹ ڈالی تھی۔ جس کی وجہ سے اجنبی کے خدوخال جو ایک لمحے قبل تک دھندلے دھندلے سے نظر آ رہے تھے یکلخت روشنی میں صاف نظر آنے لگے۔ میری چیخ اور سڑک پر کھڑے ہوئے شخص کی ہیبت

کنذائی نے میرے شوہر کو بھی بری طرح بوکھلا دیا تھا۔"

"وہ شخص لباس کے اعتبار سے کسی مہذب خاندان کا ایک ذی حیثیت فرد لگ رہا تھا۔ لیکن اس کا چہرہ اس قدر بھیانک اور ہولناک تھا کہ اسے کسی انسان کا چہرہ نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ گردن سے اوپر کا تمام حصہ بڑے بڑے اور الجھے ہوئے بالوں کے درمیان چھپا ہوا تھا۔ لیکن سیاہ بالوں کے درمیان سے اس کی سرخ سرخ آنکھیں دہکتے انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس کے دونوں ہاتھ جسے اس نے گاڑی رکوانے کے لئے فضا میں بلند کر رکھے تھے اس کے چہرے ہی کی طرح کسی دہشتناک بلا سے ملتے جلتے تھے۔ کلائی سے اوپر کا حصہ بھی سیاہ رنگ کے گھنے بالوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ کسی جنگلی درندے جیسا نظر آیا تھا۔ خاص طور پر اس کی خم کھائی نوکدار انگلیاں کسی عقاب کے خونیں پنجوں سے مشابہت رکھتی تھیں۔"

"اس روندے نما انسان کو دیکھتے ہی میں دہشت کے مارے چیخ پڑی۔ میرے شوہر نے جو اس بلا کو دیکھ کر بری طرح بوکھلا گئے تھے۔ جلدی سے گاڑی کو پورا بریک لگا کر روکا پھر برق رفتاری سے اسے موڑ لیا لیکن قبل اس کے کہ وہ موت سے فرار حاصل کرنے میں کامیاب ہو پاتے وہ پر اسرار بلا "آنا" فانا" لپکتی ہوئی گاڑی کے قریب آگئی اور اس نے اپنے عقابی پنجوں کو اندر ڈال کر میرے شوہر کے سر کو بالوں کو دبوچ لیا پھر دروازہ کھول کر انہیں باہر سڑک پر کھینچ لیا۔ موت کے تصور نے جیسے میرے سارے جسم کا خون نچوڑ لیا تھا لیکن اس کے باوجود میں حلق پھاڑے مدد مدد چلا رہی تھی۔ دوسری طرف اس پر اسرار بلا نے میرے شوہر کو زمین پر ڈال رکھا تھا اور خود ان کے سینے پر چڑھا بیٹھا اپنے نوکیلے پنجوں سے ان کے چہرے کو مسخ کر رہا تھا۔ جب میں نے اپنے شوہر کی دل خراش چیخوں کو مدھم پڑتے محسوس کیا تو خوف سے میری آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ میں اپنی سیٹ پر بیٹھی بری طرح کپکپا رہی تھی۔ معا" مجھے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے وہ پر اسرار اور خوفناک بلا میرے شوہر کو مارنے کے بعد مجھ پر حملہ آور ہو۔ اس خیال کے آتے ہی میں لرز اٹھی میں نے بڑی آہستگی سے خود کو کھسکا کر دوسری سیٹ پر کیا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے اسے پوری رفتار سے دوڑانے لگی ---------- مجھے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ نہ ہی مجھے یہ یاد ہے کہ میری گاڑی

کسی عمارت سے ٹکرائی تھی۔ صرف اتنا ضرور محسوس ہوا کہ ڈرائیونگ کرتے کرتے مجھے اچانک ایک زور دار جھٹکا لگا تھا۔ اس کے بعد میرا ذہن تاریکی میں ڈوب کر رہ گیا۔ ہوش آنے پر میں نے خود کو ہسپتال میں پایا۔"

پولیس رپورٹ کے مطابق تیسرے حادثے کا مقتول ایک بزنس مین تھا۔ اس کی لاش بھی تقریبا" اسی حالت میں پائی گئی جس حالت میں رام دیال کی لاش ملی تھی۔ مقتول کی بیوہ نے انسپکٹر خان سے ایک ملاقات میں بتایا تھا کہ اس کا شوہر بیحد ہردلعزیز شخصیت کا مالک تھا اور یہ کہ وہ کسی ایسے شخص پر اپنا شبہ ظاہر کرنے سے قطعی قاصر ہے جس پر قتل کرنے کے امکانات کا جائزہ لیا جا سکے۔

اس تیسری واردات نے جہاں انسپکٹر خان کے ذہن کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں وہاں جارج ٹاؤن کے علاقے میں بھی خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ با اثر بڑے بڑے تجارت پیشہ افراد نے پولیس کی کارکردگی کو کھلے الفاظ میں نہ صرف یہ کہ برا بھلا کہا بلکہ براہ راست آئی جی سے مل کر ان حادثات کی روک تھام کے لئے کوئی فوری اور موثر اقدام کرنے پر زور دیا تھا۔ لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا البتہ یہ ضرور ہوا تھا کہ اس علاقے میں پولیس کی رات کی گشتی فورس میں مزید اضافہ ہو گیا۔ علاقے کے لوگوں نے محتاط ہو کر رہنا شروع کر دیا۔ گیارہ بجے کے بعد وہ بغیر کسی بہت ہی اہم ضرورت کے اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ ان پر اسرار حادثات کے بارے میں مختلف روایات مشہور ہونے لگی تھیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ حرکت محض علاقے میں خوف و ہراس پھیلانے کے غرض سے کی جا رہی ہے۔ چند افراد ایسے بھی تھے جو ان واقعات کی پشت پر کسی بدروح اور آسیب کا ہاتھ محسوس کر رہے تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے دبی زبان میں اس بات کا شبہ بھی ظاہر کیا تھا کہ ان پر اسرار حادثات کی پشت پر سیاہ علم کے کسی ماہر کا شیطانی ہاتھ کام کر رہا ہے۔

تیسری شاہراہ پر چونکہ دو وارداتیں ہو چکی تھیں اس لئے اس علاقے کے لوگ زیادہ خوفزدہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے طور پر فضلو کی خدمات حاصل کر لی تھیں جو کسی زمانے میں پہلوانی کیا کرتا تھا وہ بیحد نڈر اور دلیر شخصیت کا مالک تھا۔ فضلو کو محلے کی چوکیداری کے لئے منتخب کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کا باپ تعویذ گنڈوں

اور جھاڑ پھونک کرنے کے معاملات میں خاصا مشہور تھا اور اب کوئی صورت نہ بنتے دیکھ کر اس طرف رجوع ہونے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا لوگ بری طرح دہشت زدہ ہو گئے تھے۔

درمیان کے واقعات کا ذکر باعث طوالت ہو گا اتنا عرض کر دیا جائے کہ واقعے کی سنگینی نے پولیس کے تمام عملے کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

انسپکٹر خان اپنی تمام تر فورس اور صلاحیتوں کے ساتھ ان پر اسرار قتل کی وارداتوں کی چھان بین میں مصروف تھا لیکن بیس پچیس روز تک مسلسل شب روز کی دوڑ دھوپ کے باوجود وہ ابھی تک کسی آخری نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔

چوتھی واردات پولیس فائل کے مطابق 20 مئی کو ہوئی تھی۔

گرمیوں کی وہ رات کچھ زیادہ خوش گوار نہ تھی۔ ہوا سر شام ہی سے بند تھی جس کی وجہ سے حبس سا ہو رہا تھا۔ چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ آسمان پر چمک رہا تھا۔ اس کی سیمیں کرنوں نے پورے شہر کو منور کر رکھا تھا۔

اس وقت رات کے بارہ کا عمل رہا ہو گا۔ جب فضلو چوکیدار خبردار ہوشیار کی آوازیں لگاتا ہوا تیسری شاہراہ پر ریگل پارک کے سامنے سے گزر رہا تھا حسب معمول اس نے آج بھی اپنے ہاتھ میں وہی لٹھ لے رکھا تھا جس کے اوپری سرے پر پیتل کا وزنی گول مٹھ موجود تھا۔ کچھ دیر پیشتر فضلو کی ملاقات ایک گشتی پولیس پارٹی سے بھی ہوئی تھی جس کی قیادت سارجنٹ بیلے کر رہا تھا۔ رسمی سلام و دعا کے بعد فضلو نے سارجنٹ بیلے کو علیحدہ لے جا کر دبی زبان میں کہا۔

"صاحب -------- آج رات ذرا زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔"

"کیوں -------- کیا تم کوئی خطرے کی بو سونگھ رہے ہو" سارجنٹ بیلے نے دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ بات نہیں ہے صاحب۔" فضلو نے سرگوشی کی۔ "میرے باپ نے مجھے بتایا ہے کہ آج کی رات اس علاقے کے لوگوں پر بھاری گزرے گی۔"

"تمہارے باپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی۔" سارجنٹ نے چبھتی نظروں سے فضلو کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"میرے باپ اللہ والے' ہیں صاحب ان کی کہی ہوئی باتیں شاذو نادر ہی غلط ہوتی ہیں۔" فضلو نے اپنے باپ کی تعریف کرتے ہوئے بڑے فخریہ انداز میں سینہ تان کر کہا۔ "چار روز پہلے کی بات ہے جب میرے باپ نے ایک ہندو مردے کی روح کو جلا کر بھسم کر ڈالا۔ وہ کمبخت ہمارے محلے کی ایک بانکی سجیلی لڑکی پر قبضہ جمائے ہوئے تھا لیکن میرے باپ نے پلک جھپکتے میں اس کی ایسی تیسی کر کے رکھ دی۔"

"نان سنس۔" سارجنٹ بیلے نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔ "میں ان حماقتوں کا قائل نہیں ہوں۔ سب بکواس ہے۔ ایک دم نان سنس۔"

"تم جانو صاحب -------- میں نے تو اپنا فرض سمجھتے ہوئے تم کو آگاہ کر دیا ہے۔"

"تم کس مرض کی دوا ہو پہلوان" سارجنٹ نے چوکیدار کا مذاق اڑاتے ہوئے جواب دیا۔ "کیا تم پر اسرار بلاؤں سے کشتی لڑنے کی ہمت نہیں رکھتے۔"

"میں اپنے خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا صاحب پہلوانی چھوڑ چکا ہوں تو کیا ہوا -------- اب بھی تم جس سے چاہو جوڑ کرا کے دیکھ لو .... ایک ہی ہلے میں اگر سالے کی گردن کی ہڈی نہ توڑ دوں تو فضلو نہیں چمار کہیں۔"

سارجنٹ بیلے اسے حقارت سے گھورتا ہوا گشت پر آگے چلا گیا تو فضلو نے دل ہی دل میں اسے دو چار گالیاں بکیں پھر خبردار ہوشیار کی آوازیں لگاتا ہوا اپنے فرض کی بجا آوری میں لگ گیا۔ آج وہ روزانہ کے مقابلے میں کچھ زیادہ محتاط چوکنا نظر آ رہا تھا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ آج کچھ نہ کچھ ہو کر رہیگا۔ گھر سے چلتے وقت اس کے باپ نے چاندی کا کوئی تعویذ اس کے بازو پر باندھا تھا اور کہا تھا آج اسے خود اپنے سائے سے بھی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے چنانچہ فضلو سچ مچ اپنے سائے سے بھی محتاط ہو کر آگے بڑھ رہا تھا۔

ریگل پارک کے قریب سے گزرتے وقت ایک بار پھر اسے خبردار ہوشیار کی زور دار آواز بلند کی پھر بیڑی سلگانے کے ارادے سے ایک لیمپ پوسٹ سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنا لٹھ بھی اس نے بجلی کے پول سے ٹکا کر کھڑا کر دیا تھا لیکن قبل اس کے وہ بیڑی سلگانے کے لئے ماچس کو روشن کرتا کہیں قریب سے کسی شیشے کے ٹوٹنے کی

پرشور آواز گونجی اور فضلو نے ایک دم بیڑی پھینک کر لٹھ پر اپنی گرفت مضبوط کی اور بڑی تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹ کر قدرے اندھیرے میں ہو گیا پھر اس نے آواز کی سمت دیکھا جو اس کے اندازے کے مطابق سڑک کے اس پار والی کسی کوٹھی سے سنائی دی تھی۔ جلدی جلدی اس نے سامنے والی تمام کوٹھیوں کو دیکھا لیکن کوئی چیز نظر نہیں آئی۔

کچھ دیر تک وہ تاریکی میں دم سادھے کھڑا رہا پھر اس خیال سے کہ ممکن ہے شیشہ ٹوٹنے کی آواز محض اس کا وہم رہی ہو اس نے اپنے بازوؤں کی ابھری ہوئی مچھلیوں کو ہاتھ ڈھیلا کر کے ختم کیا پھر آگے بڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اس کی نظر سامنے والی پیلی کوٹھی کے آہنی پھاٹک پر جم کر رہ گئی۔ بجلی کی روشنی میں اس نے کسی شخص کو جو سیاہ رنگ کے کپڑے میں ملبوس تھا بڑی مشکوک حالت میں پھاٹک پر چڑھ کر باہر کودتے دیکھا۔ فاصلہ چونکہ زیادہ تھا اس لئے فضلو اس کی صورت نہ دیکھ سکا لیکن اتنا اندازہ تو اس نے بہر حال کر لیا تھا پھاٹک سے کود کر باہر آنے والا یقیناً" کوئی چور یا پھر ڈاکو ہو سکتا ہے۔ لٹھ پر اپنی گرفت مضبوط کر کے وہ لپکتا ہوا روشنی میں آ گیا پھر اس نے وہیں سے مشتبہ آدمی کو بری گھمبیر آواز میں للکارا۔ "رک جاؤ ------- اگر بھاگنے کی کوشش کی تو مارے لٹھوں کے کچومر نکال کر رکھ دوں گا۔"

پیلی کوٹھی سے باہر آنے والا اپنے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈالے تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا فضلو کی گرجدار آواز سن کر یکلخت رک گیا پھر آہستہ سے گھوم کر جب اس نے فضلو کو دیکھا تو ایک لمحے کے لئے فضلو بھی کانپ کر رہ گیا۔ سیاہ لباس والے کے چہرے پر اسے لمبے لمبے بالوں کا ایک گھنا جنگل نظر آیا تھا۔ جس کے درمیان اس کی سرخ سرخ چمکدار آنکھیں بڑی ہیبتناک لگ رہی تھیں۔ فضلو اپنی جگہ کھڑا اسے حیرت بھری نظروں سے دیکھتا رہا لیکن جب سیاہ لباس والے نے اپنے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں سے باہر نکالے تو فضلو نے فوراً" ہی تاڑ لیا کہ اس کا مقابلہ کسی بلا سے ہونے والا ہے۔ ہر چند کہ فضلو کم ہمت یا ڈرپوک آدمی نہیں تھا لیکن عجیب و غریب حلیے کے اس شخص کو یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر چند ثانئے کے لئے وہ

سہم ضرور گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے جلدی سے اپنے باپ کے بتائے ہوئے ایک عمل کو پڑھ کر اپنے اوپر دم کیا ور لٹھ گھما کر بولا۔

"دور کھڑا جنگلی سور کی طرح کیا گھور رہا ہے۔ ذرا میدان میں آ کر دیکھ۔ اگر ایک ہی لٹھ میں ریڑھ کی ہڈی کے دو ٹکڑے نہ کر دوں تو فضلو نہیں چمار کہنا۔"

جواب میں سیاہ لباس والی بلا بڑے خونخوار انداز میں اپنے حلق سے خرخراہٹ کی آوازیں نکالتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ اس نے اپنے عقابی پنجوں نما ہاتھ کو فضا میں یوں پھیلا رکھا تھا جیسے وہ اچانک حملہ کرنے کے لئے مناسب موقع کی منتظر ہو۔

فضلو نے اس انسان نما وحشی درندے کو قریب آتا دیکھا تو جلدی سے لٹھ کو زمین پر مار کر پینترا بدل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں پوری طرح قریب آنے والی بلا پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے جسم کی ساری ہی مچھلیاں تن کر ابھر آئی تھیں اور ایسا ہمیشہ اسی وقت ہوتا تھا جب فضلو کسی حریف سے مقابلے کی ٹھان لیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ پورے طور سے اس بلا سے مقابلے کے لئے تیار تھا۔ جیسے جیسے عقابی پنجوں والا اس کے نزدیک آتا گیا فضلو کے خون کی گردش تیز ہوتی گئی لیکن پھر اچانک ہی کسی پرندے کی تیز آواز نے دونوں ہی کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لی۔ فضلو نے ایک بوڑھے گدھ کو بڑی تیزی سے نیچے آ کر عقابی پنجے والے کے سر کی طرف جھپٹتے دیکھا تھا۔ اتنی رات گئے کسی گدھ کا ایک زندہ انسان پر یوں حملہ آور ہونا فضلو کے لئے بڑے تعجب کی بات تھی لیکن اس وقت اسے سخت حیرت ہوئی جب عقابی پنجوں والا بوڑھے گدھ کو دیکھ کر بڑی خوفناک اور کریہہ آواز میں چلایا پھر وہ پلٹ کر بھاگتا ہوا ایک گلی میں داخل ہو گیا۔

معاً" فضلو کو خیال آیا کہ کہیں اس سیاہ رنگ کے گدھ نے تو اس پر اسرار درندے نما انسان کو نہیں بھگا دیا۔ اپنے باپ کی زبان سے وہ ایسے بہت سارے پر اسرار واقعات سن چکا تھا جس میں کسی بدروح نے کسی انسان یا پرندے کے جسم پر قبضہ کر لیا تھا اور اپنی تباہ کاریوں سے لوگوں کو پریشان کر رکھا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی فضلو ایک لمحے کے لئے سہم گیا پھر اسے وہ تعویذ یاد آ گیا جو اس کے باپ نے اس کے بازو پر باندھ رکھا تھا۔ دوسرے ہی لمحے فضلو لٹھ سنبھال کر گدھ پر جھپٹ پڑا۔ گدھ

نے اپنی خونخوار اور چمکدار نظروں سے دیکھا پھر کریہہ آواز حلق سے نکالتا بلندی پر چلا گیا لیکن پھر اچانک پشت سے اتنی تیزی سے نیچے آیا کہ فضلو کو سنبھلنا مشکل ہو گیا۔ گدھ اپنے نوکیلے پنجوں اور لمبی چونچ سے اسے زخمی کر کے پھر اوپر چلا گیا تھا۔ فضلو نے بری غضبناک نظروں سے گدھ کو دیکھ کر صلواتیں سنانے لگا۔ زخموں کی سوزش نے اس کے غصے کو اور بھڑکا دیا تھا۔ وہ لٹھ پر اپنی گرفت مضبوط کئے دوبارہ گدھ کے نیچے آنے کا منتظر تھا کہ اچانک فائر کی آواز گونجی اور گدھ کی روشن آنکھوں میں سے ایک بجھ کر رہ گئی۔ وہ بڑی خوفناک آواز میں چیختا ہوا اوپر بلند ہوا پھر پیلی کوٹھی کے عقب میں جا کر نظروں سے غائب ہو گیا۔

فضلو نے پلٹ کر دیکھا۔ سارجنٹ بیلے اپنا ریوالور ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ گدھ کے چلے جانے کے بعد اس نے آگے بڑھ کر سڑک پر گرنے والے خون کے قطروں کو دیکھا پھر فضلو سے پوچھا۔ "یہ پرندہ تم پر کب حملہ آور ہوا تھا۔"

"اگر یہ منحوس نہ آگیا ہوتا تو آج میں نے اس پر اسرار بلا کو ضرور ٹھکانے لگا دیا ہوتا۔" فضلو نے اپنے شانے پر آئے ہوئے زخم کو سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

سارجنٹ بیلے نے فضلو سے تفصیل دریافت کی اور گشتی عملے کے افراد کے ساتھ اس طرف چلا گیا جدھر عقابی پنجوں والا فرار ہو گیا تھا۔ گشتی عملے کے افراد سارجنٹ بیلے کی ہدایت پر ایک ایک گلی کوچے کو چھانتے پھر رہے تھے۔ دو گھنٹے کی تھکا دینے والی دوڑ دھوپ کے باوجود وہ سوائے ایک انگریزی خاتون کی لاش کے اور کوئی سراغ نہ پا سکے۔ پر اسرار بلا نے اس انگریز خاتون کو چوتھی شاہراہ کی ایک نیم تاریک گلی میں اپنی درندگی کا نشانہ بنا کر چھوڑ دیا تھا۔ دوسری وارداتوں کی طرح انگریز خاتون کی لاش پر سے بھی ویسے ہی کھرونچے کے نشانات ملے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس بدنصیب خاتون کے سلسلے میں عقابی پنجوں والے نے کچھ زیادہ ہی درندگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ مقتولہ کے جسم پر نظر آنے والا نائٹ گاؤن دھجیوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کے برہنہ سینے سے گوشت حد تک مسخ کر دیا گیا تھا۔ ظاہری حالت سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ عقابی پنجوں والے نے غالباً" اس خاتون کو مارنے سے پہلے یا مارنے کے بعد اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل دہشتناک انداز میں کی تھی۔

سارجنٹ بیلے نے قریب کے دو ایک مکانوں کے افراد کو جگا کر مقتولہ کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا نام میری ایڈگر ہے اور وہ چوتھی شاہراہ کے انیسویں بنگلے میں رہتی ہے۔ مطلوبہ مکان سے میری کی بوڑھی ملازمہ نے روتے ہوئے یہ بتایا کہ میری دو ماہ پیشتر ہی بیوہ ہوئی تھی۔ اس کا شوہر جو ایک سرکاری آفیسر تھا کسی ذاتی پرخاش کی بنا پر قتل کر دیا گیا تھا۔ میری کے بارے میں بوڑھی ملازمہ نے صرف یہی بتایا کہ وہ تقریباً" دو گھنٹے پہلے فائرنگ کی آواز سن کر دیوانگی کے عالم میں باہر گئی تھی۔ جاتے جاتے اس نے اپنی ملازمہ سے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے قاتل کو تلاش کرنے جا رہی ہے۔ ملازمہ کے بیان کے مطابق ایڈگر کی موت کے بعد سے اکثر میری اسی قسم کی بے سروپا باتیں کرتی رہتی تھی۔ سارجنٹ بیلے نے اپنے ایک کانسٹیبل کو لاش کے قریب چھوڑا اور باقی آدمیوں کو ساتھ لے کر دوبارہ اس درندے نما انسان کی تلاش میں چل دیا۔ صبح ہونے تک اس نے ساتویں شاہراہ تک کا ایک ایک چپہ چھان مارا لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

21 مئی کی صبح فضلو نے انسپکٹر خان سے ملاقات کی اور اسے گزشتہ رات پیش آنے والے حادثے کی روداد بڑی تفصیل سے بتائی۔ انسپکٹر کو حالات سے آگاہ کرتے وقت فضلو نے اپنے بیان میں ایک اہم اضافہ بھی کیا۔ وہ یہ تھا کہ صبح کی اجلی روشنی میں اس نے تیسری شاہراہ والی پیلی کوٹھی کی دوسری منزل پر واقع ایک کھڑکی کے شیشے کو ٹوٹا ہوا پایا تھا۔ فضلو نے اپنا شبہ ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ویقیناً" وہی کھڑکی ہو سکتی ہے۔ جس کے شیشے ٹوٹنے کی آواز سن کر وہ گزشتہ رات چونکا تھا لیکن اندھیرے کی وجہ سے رات کو اس ٹوٹے ہوئے شیشے کو نہیں دیکھ پایا تھا۔ اس نے اس بات کا اقرار بھی کیا کہ ذاتی ناپسندیدگی کی وجہ سے اس نے سارجنٹ بیلے کو دانستہ ان حالات سے باخبر نہیں کیا۔

انسپکٹر خان نے فضلو کے بیان کردہ واقعات کو بڑی دلچسپی سے سنا پھر پہلا کام جو اس نے کیا وہ تیسری شاہراہ پر واقع پیلی کوٹھی میں رہنے والوں کے متعلق اہم معلومات حاصل کرنا تھا۔ اس کام کے لئے اس نے اپنے ایک قابل اعتماد ماتحت سارجنٹ منصور کو منتخب کیا اور اسے ہدایت کی کہ معلومات حاصل کرتے ہوئے اس بات کا خاص

خیال رکھا جائے کہ پیلی کوٹھی کے مکینوں کو اس امر کی ہوا بھی نہ لگ سکے کہ پولیس ان میں دلچسپی لے رہی ہے۔

سارجنٹ منصور نے 21 مئی کو ہی شام کے پانچ بجے انسپکٹر خان کو مطلوبہ اطلاعات فراہم کر دیں۔ اس نے اپنی چھان بین کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا تھا کہ پیلی کوٹھی میں ایک ریٹائرڈ افیسر گزشتہ پانچ ماہ سے کرائے پر مقیم ہے۔ اس دو منزلہ عمارت میں صرف وہ اور اس کی بیوی مقیم ہیں۔ گھر کے کام کاج کے لئے دو ملازمین بھی ہیں جنہیں چراغ جلے کے بعد چھٹی دے دی جاتی ہے۔ ریٹائرڈ آفیسر کا نام سارجنٹ منصور نے حسن واسطی بتایا تھا جو مصری نژاد تھا اور اسے ہندوستان آئے ہوئے صرف سات مہینے ہوئے تھے۔ دو ماہ تک وہ تھوڑے تھوڑے دنوں کے لئے مختلف ہوٹلوں میں رہا تھا اس کے بعد وہ جارج ٹاؤن کی اس کوٹھی میں منتقل ہو گیا جس میں مجموعی طور پر سات کمرے تھے۔ حسن واسطی نے دوسری منزل کے تین کمروں کو اپنے لئے منتخب کیا تھا۔ اس کی بیوی نچلے حصے میں رہتی تھی۔ سارجنٹ منصور نے جو تفصیلات فراہم کی تھیں اس میں سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ حسن واسطی دوسری منزل پر کسی کا آنا پسند نہیں کرتا تھا۔ ملازموں کے علاوہ اس نے اپنی بیوی کو بھی سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ صرف نچلی منزل تک محدود رہے۔ سارجنٹ منصور نے یہ اطلاعات حسن واسطی کے ایک ملازم کی مٹھی گرم کرنے کے بعد حاصل کی تھیں۔ ملازموں نے یہ بھی بتایا کہ اس کے پاس حیرت انگیز نوادر کا اجتماع ہے۔

انسپکٹر خان نے ازسرنو سابقہ حادثات کی تفصیل دیکھی تو چونک اٹھا۔ اب تک جتنی وار دات بھی ہوئی تھیں وہ سب چاند کی سترھویں تاریخ کو ہوئی تھیں۔ اگر فضلو نے اپنے باپ کی کہی ہوئی بات کا ذکر اس سے نہ کیا ہوتا تو شاید انسپکٹر خان تمام زندگی اس نکتے پر غور نہ کرتا لیکن اب وہ بڑی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ آخر یہ کیا اسرار ہے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وہ تیسرے روز فضلو کے گھر پہنچ کر اس کے باپ سے ملا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اس پر اسرار راز کو حل کرنے میں اس کی مدد کرے۔

"میں فضلو کی زبانی تمام حالات سن چکا ہوں" فضلو کے باپ نے بڑی مدھم آواز

میں کہا وہ بہت دیر گردن جھکائے خاموش رہا اور جب اس نے گردن اٹھا کر آنکھیں کھولیں تو وہ سرخ ہو رہی تھیں۔ "اس علاقے پر کسی منحوس پرندے کا سایہ ہے۔ وہ کوئی گندی روح ہے۔ جب تک اسے تلاش کر کے جلا کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل نہیں کیا جاتا یہ حادثات برابر ہوتے رہیں گے۔"

"کیا آپ اپنے عمل کے زور سے اس گندی بلا کو ختم نہیں کر سکتے۔"

"کر سکتا ہوں۔ مگر اس کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ میرے سامنے موجود ہو اور یہ یوں ناممکن ہے کہ مجھے اس تک پہنچنے کے لئے کوئی موقع فراہم نہ کیا جائیگا اور نہ میں عملیات میں اس قدر ماہر ہوں کہ یہاں بیٹھے بیٹھے اسے جلا کر خاک کر دوں۔ اگر یہ بات ممکن ہوتی تو بار بار بے گناہوں کا خون کیوں سڑکوں پر بہتا۔ میں تمہیں ہدایت دے سکتا ہوں۔ میں دعائیں کر سکتا ہوں اور جو کچھ اللہ نے مجھے دیا ہے۔ اسے کام میں لا سکتا ہوں۔"

"لیکن اس پرندے کو تلاش کہاں کیا جائے۔" انسپکٹر خان نے تشویش انگیز لہجے میں پوچھا۔

"وہ یقیناً" اس علاقے میں کہیں ہے۔ تم تمام مشکوک گلیوں کی تلاشی لو۔ تو کہیں نہ کہیں تمہیں اس کا سراغ مل جائے گا۔ اور ہاں سنو ------- اگر تم اس کے سراغ میں کامیاب ہو جاؤ اور میری بات سچ نکلے تو تم اس پرندے کو دن کے وقت جلانا۔ رات میں اس کا جلانا مناسب نہیں ہے۔ ورنہ تم کسی خطرے میں گھر سکتے ہو۔ حوصلہ رکھو۔ میں تمہارے لئے دعائیں کر رہا ہوں۔"

انسپکٹر خان۔ فضلو کے والد سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے تھانے آ کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ علاقے کے تمام لوگوں کے بارے میں تفصیلات کا جائزہ لیا۔ مشکوک لوگوں اور مکانات کی ایک فہرست بنائی۔ جارج ٹاؤن میں جرائم ہوتے ہی نہیں تھے۔ صرف چوری وغیرہ کی وار داتیں ہی اکثر ہوا کرتی تھیں۔ علاقے کے لوگ بڑے پر امن اور پر سکون طریقے سے رہتے تھے۔ علاقے میں جو آ جاتا وہ اس ماحول کو اتنا پسند کرتا کہ شہر کی کسی دوسری جگہ منتقل نہیں ہونا چاہتا۔ ایک دن اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ یہ وار داتیں گزشتہ چار پانچ ماہ سے ہو رہی ہیں۔ چنانچہ نئے آنے والے

مکینوں کے بارے میں ایک فہرست ترتیب دی جائے۔ نئے مکینوں کی تعداد بہت کم تھی کہ جارج ٹاؤن میں مکان ملنا بہت دشوار تھا۔ گزشتہ چھ مہینے میں صرف تین خاندان اسے ایسے ملے جو اس علاقے میں نئے نئے آ کر بسے تھے۔ اور ان میں پہلی کوٹھی کا مکین بھی شامل تھا۔

وہ زیر لب بڑبڑایا۔ "سارجنٹ منصور کی ہدایت کے مطابق ...."

وہ بہت دیر تک غور کرتا رہا اور پھر ایک عزم کے ساتھ اٹھا۔ اس کا رخ پہلی کوٹھی کی طرف تھا ....

چوتھے دن یعنی 25 کو انسپکٹر خان نے براہ راست حسن واسطی سے اس کے گھر پر ملاقات کی گفتگو کے دوران اس نے خاص طور پر محسوس کیا تھا کہ حسن واسطی اس کی آمد سے خوش نہیں ہے۔ ان دونوں کی ملاقات نچلے حصے کے ایک مختصر سے کمرے میں ہوئی تھی۔ انسپکٹر خان نے حسن واسطی کو یہی بتایا تھا کہ وہ علاقے میں پیش آنے والے حادثات کی چھان بین کی خاطر لوگوں سے مل رہا ہے۔ باتوں باتوں میں اس نے جب حسن واسطی سے ان پر اسرار واقعات کے ضمن میں اس کا خیال معلوم کیا تو وہ ایک لمحے کے لئے نروس ہو گیا پھر فوراً" خود پر قابو پاتا ہوا بولا۔

"میرا ذاتی خیال ہے کہ ان وار دات میں کسی شرپسند آدمی کا ہاتھ ملوث ہو گا۔"

انسپکٹر خان بہت غور سے حسن واسطی کے چہرے کے ایک ایک اتار چڑھاؤ کو دیکھتا رہا پھر کچھ توقف کے بعد وہ براہ راست اصل مقصد کی طرف آ گیا۔

"بیس مئی کی رات کو علاقے کے چوکیدار کو ایک ایسا ہی حادثہ پیش آتے آتے رہ گیا۔" انسپکٹر خان نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "اگر عین وقت پر گدھ نہ آ گیا ہوتا تو ممکن تھا فضلو بھی اس پر اسرار بلا کے ہاتھوں قتل ہو جاتا ——— اسی رات ایک اہم بات اور بھی ہوئی تھی جس کی اطلاع مجھے آپ کے پڑوسی سے ملی ہے۔"

"میرا پڑوسی۔" حسن واسطی چونک پڑا۔

"آپ کے پڑوسی کا بیان ہے کہ اس نے اکیس مئی کی رات کو نصف رات کے بعد آپ کی کوٹھی کے دوسری منزل کے اس کمرے کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کی آواز سنی تھی جو بائیں باغ کی سمت کھلتی ہے۔"

"وہ بکواس کرتا ہے۔" حسن واسطی نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو مجھے اس کا علم ضرور ہوتا۔"

"ہو سکتا ہے شیشہ ٹوٹنے کی آواز آپ کے پڑوسی کا وہم رہی ہو ——— ویسے کیا میں آپ کے اوپر والے کمروں کو ایک نظر دیکھ سکتا ہوں۔" انسپکٹر نے چبھتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کس سلسلے میں" ——— حسن واسطی سرخ ہو گیا۔

"میں اپنی ذاتی تسلی کے لئے ان کمروں کو دیکھنا ضروری سمجھتا ہوں" انسپکٹر خان نے اس بار روکھی آواز میں کہا پھر جیب سے تلاشی کا وارنٹ نکال کر حسن واسطی کی طرف بڑھا دیا جو اس نے اپنی خفیہ رپورٹ پر صبح ہی حاصل کر لیا تھا۔

حسن واسطی وارنٹ پر نظر پڑتے ہی مارے غصے کے اپنے ہونٹ چبانے لگا۔ کچھ دیر تک وہ اپنے خیالات میں مستغرق رہا پھر جب انسپکٹر خان نے دوسری بار مخاطب کر کے اوپر چلنے کو کہا تو وہ طوعاً" وکرہاً" اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا لیکن اس کے چہرے پر بدستور وحشت برس رہی تھی۔

انسپکٹر خان نے دیدہ دانستہ پہلے ان دو کمروں کو دیکھا جو حسن واسطی کی خوابگاہ سے ملحق تھے۔ ان کمروں میں اسے بے شمار نوادر نظر آئے جو غالباً" حسن واسطی نے آثار قدیمہ کے محکمے کی ملازمت کے دوران حاصل کئے تھے۔ ان دونوں کمروں کو دیکھنے کے بعد جب وہ حسن واسطی کی خوابگاہ میں داخل ہوا تو سب سے پہلے اس کی نظر جس چیز پر پڑی وہ ایک بلند قامت گدھ تھا۔ جسے دیوار کے سہارے ایک چوبی تختے کو لگا کر اس پر سجایا گیا تھا۔ انسپکٹر خان نے اس میں جو بات خاص طور پر نوٹ کی وہ اس کی بائیں آنکھ تھی جس کی پتلی غائب تھی اور زخم کا نشان بہت واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ بظاہر وہ ایک ایسا ہی پرندہ لگ رہا تھا جس کے اندر کی آلائش کو صاف کر کے مخصوص مسالوں کے ذریعے محفوظ کر لیا گیا ہو۔ دوسری چیز جس نے انسپکٹر خان کو اپنی طرف متوجہ کیا وہ گہرے نشانات تھے جو کمرے کے دروازوں اور کھڑکیوں پر اندر کی سمت نظر آ رہے تھے۔ انسپکٹر خان بڑی تیزی سے حسن واسطی کی طرف گھوم پڑا جو اس کے پیچھے کھڑا بڑی کینہ توز نظروں سے اسے گھورے جا رہا تھا۔

"میرے محترم ---------- کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ دروازوں اور کھڑکیوں کی لکڑی پر یہ کھرونچے نما گہرے نشانات کس طرح رونما ہوئے ہیں۔" انسپکٹر خان کا لہجہ بڑا نرم مگر چبھتا ہوا تھا۔

"یہ نشانات اس وقت بھی موجود تھے جب میں نے یہ کوٹھی کرائے پر حاصل کی تھی" حسن واسطی نے اپنا نچلا ہونٹ چباتے ہوئے بے رخی سے جواب دیا۔

"میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا تھا" خان نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا پھر وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اس کھڑکی کے قریب گیا جس کی نشان دہی فضلو نے کی تھی۔ فریم میں بڑے صاف شفاف شیشے لگے ہوئے تھے جبکہ دوسری کھڑکیوں کے شیشے کم گدلے نظر آ رہے تھے۔ انسپکٹر خان نے شیشے اور فریم کے کناروں پر جمے ہوئے اس سفیدے کو بھی بہت غور سے دیکھا جو زیادہ پرانا نہیں نظر آ رہا تھا۔

کھڑکی کھول کر اس نے چوکھٹ پر کہنیاں ٹکا کر نیچے کی طرف دیکھا پھر پلٹ کر حسن واسطی سے بولا "کیا اس کھڑکی کے شیشے آپ کو بہت زیادہ عزیز ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ یہ شیشے دوسری کھڑکیوں کے شیشے کے مقابلے میں زیادہ اجلے اور نئے نظر آتے ہیں۔"

"ہاں ---------- میں ان شیشوں کو روزانہ صاف کرنے کا عادی ہوں" حسن واسطی نے الفاظ چباتے ہوئے جواب دیا۔

"شاید اس لئے کہ یہاں سے بیرونی مناظر زیادہ دلفریب نظر آتے ہیں۔" انسپکٹر خان کھڑکی کے قریب سے ہٹ کر دوسری چیزوں کو دیکھنے لگا پھر اس نے دوبارہ چوبی تختے پر رکھے ہوئے گدھ پر نظر ڈالی تو حیرت سے اچھل پڑا۔ گدھ کی دائیں آنکھ اپنے حلقے میں یوں چمک رہی تھیں۔ جیسے اس میں ابھی تک زندگی کی رمق باقی ہو ---------- کمرے میں داخل ہوتے وقت اس نے اسی آنکھ کو بہت غور سے دیکھا تھا لیکن اس وقت اسے اس میں زندگی کی کوئی حرارت نہیں محسوس ہوئی تھی۔ اچانک اسے فضلو کے باپ کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں آپ ہی آپ تیز ہونے لگیں پھر ایک سرگوشی اس کے کان میں ابھری۔

"انسپکٹر خان ---------- تمہارا مطلوبہ منحوس پرندہ یہی ہے۔ جتنی جلدی ممکن

ہو سکے اسے جلا کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دو۔"

انسپکٹر خان نے اس سرگوشی کو بہت واضح طور پر سنا تھا۔ چند ثانئے تک وہ گدھ کو بغور دیکھتا رہا پھر اس نے حسن واسطی کی طرف دیکھ جس کی نظروں میں وحشت ناچ رہی تھی۔

"میرے محترم ---------- مجھے افسوس ہے میں نے بلا وجہ آپ کو پریشان کیا۔" اس نے بڑی شائستہ زبان میں حسن واسطی سے معذرت طلب لہجے میں کہا۔ "میں اب واپس جا رہا ہوں لیکن کیا آپ ازراہ کرم مجھے اس کمرے سے میرا ایک دل پسند تحفہ عنایت کریں گے۔"

"تحفہ ---------- میں سمجھا نہیں۔" حسن واسطی نے پلکیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔

"اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو اس گدھ کو میں لیجاؤں ---------- لیکن کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گے کہ اس کی ایک آنکھ کس طرح ضائع ہوئی تھی" انسپکٹر خان نے اس بار سپاٹ آواز میں کہا۔ "اگر اس کی دونوں آنکھیں ہوتیں تو اس کی خوبصورتی میں کوئی کلام نہ ہوتا ----------"

حسن واسطی کی آنکھوں میں نظر آنے والی وحشت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا وہ انسپکٹر خان کو جنونی انداز میں دیکھتا رہا پھر یکلخت بڑے حقارت بھرے لہجے میں بولا۔ "مجھے اپنے جمع کردہ ان نوادر سے جنون کی حد تک عشق ہے۔ میں ان میں سے کوئی چیز تمہیں کسی قیمت پر نہیں دے سکتا اور خاص طور پر یہ گدھ تو میں کسی قیمت پر نہیں دے سکتا۔"

"اگر میں یہ کہوں کہ اس گدھ کو میں ہر قیمت پر حاصل کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں تو ----------"

"تو ---------- میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔ حسن واسطی پر یکلخت دیوانگی کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے قریب رکھے ہوئے پیتل کے ایک ٹھوس مجسمے کو اٹھایا اور انسپکٹر خان پر بھرپور انداز میں حملہ آور ہوا لیکن انسپکٹر جو ہر متوقع حملے کے لئے پہلے ہی سے تیار تھا بڑی پھرتی سے اسے جھکائی دے کر ایک طرف ہوگیا۔ دوسرے ہی لمحے

اس نے اپنا سروس ریوالور جیب سے نکال کر کرخت لہجے میں کہا۔

"تمہاری عافیت اب اسی میں ہے۔ حسن واسطی خود کو میرے حوالے کر دو ورنہ میں بے دریغ گولی مار دوں گا۔"

لیکن حسن واسطی نے جیسے اس کی بات نہیں سنی تھی۔ اس نے پلٹ کر انسپکٹر کو عجیب خونخوار نظروں سے دیکھا پھر دوبارہ اس پر جھپٹ پڑا۔ انسپکٹر خان نے اس بار بھی خود کو بڑی خوبصورتی سے بچایا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جیب سے سیٹی نکال کر زور سے بجائی تا کہ پیلی کوٹھی کے باہر محاصرہ کئے ہوئے سادہ لباس والے خطرے کی بو محسوس کر کے اندر آ جائیں۔

حسن واسطی بدستور دیوانوں کی سی کیفیت میں انسپکٹر کو مار ڈالنے کے درپے تھا لیکن اسے اپنے ارادے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ کچھ دیر بعد پولیس کے سادہ لباس والوں نے وہاں پہنچ کر اسے اپنی گرفت میں جکڑ کر بے بس کر دیا۔ حسن واسطی کی طرف سے مطمئن ہو کر انسپکٹر خان نے آگے بڑھ کر چوبی تختے پر رکھے ہوئے گدھ کو اٹھایا پھر اسی وقت پٹرول منگا کر اس پر چھڑکا اور اسے ماچس دکھا کر ایک طرف ہو گیا۔

کمرے میں موجود تمام افراد دم بخود کھڑے زندہ گوشت جلنے کی چراہند سونگھ رہے تھے۔ حسن واسطی پوری طاقت سے چیخ چیخ کر خود کو سادہ لباس والوں کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہا تھا اچانک کمرے میں حسن واسطی کے علاوہ کسی اور کی کربناک چیخ بھی ابھر کر اذیتناک کراہٹ میں تبدیل ہوئی پھر معدوم ہوتی چلی گئی۔ پر اسرار کراہٹ کے ختم ہوتے ہی حسن واسطی بیہوش ہو کر سادہ لباس والوں کی گرفت میں جھول گیا۔

دو روز بعد جب اسے ہوش آیا تو اس نے نہ صرف انسپکٹر خان کو پہچاننے سے انکار کر دیا بلکہ ان تمام واقعات سے اپنی لاعلمی ظاہر کی جو دو روز قبل اس کے کمرے میں آ چکے تھے۔ اس خیال سے کہ حسن واسطی گدھ کے پر اسرار واقعے کو جان بوجھ کر چھپانے کی خاطر خود کو معصوم اور انجان ثابت کرنے کی غرض سے غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ انسپکٹر خان نے پولیس سرجن کی خدمات حاصل کر کے اس بات کی تصدیق کرنی چاہی کہ آیا حسن واسطی واقعی اپنی یادداشت کھو بیٹھتا ہے یا جان بوجھ کر

بگڑی ہوئی ذہنی حالت میں مبتلا ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر قبل اس کے کہ سرجن اس کا باقاعدہ سراغ لگا پاتا حسن واسطی مر چکا تھا ———

حسن واسطی کی موت کے تیسرے روز اس کی بیوی نے پولیس کو اپنا جو تحریری بیان دیا وہ بھی پولیس کے ریکارڈ پر موجود ہے۔ اس بیان کی روشنی میں پتا چلتا ہے کہ حسن واسطی نے اس پر اسرار گدھ کو ایک سال پہلے 1927ء میں مصر کے قریب سے اس وقت پکڑا تھا جب وہ ایک مردہ جانور کی سڑی گلی لاش کھانے میں مصروف تھا۔ مصر سے اپنی واپسی سے قبل اس نے بوڑھے گدھ کو جس کی عمر ماہرین نے پانچ سو سال بتائی تھی مرکر اس کے جسم کی آلائش صاف کی اور مخصوص مسالوں سے محفوظ کر کے اپنے نوادر میں شامل کر لیا۔ مرحوم کی بیوہ نے اپنے تحریری بیان میں اس بات پر خاص طور سے روشنی ڈالی تھی کہ جس روز سے وہ گدھ ان کی زندگی میں داخل ہوا تھا وہ ایک دن بھی سکون کا سانس نہیں لے سکی تھی۔ ایک جگہ اس نے اپنے بیان میں جو بات لکھی تھی وہ بے حد پر اسرار اور قابل غور ہے۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس رات چاند کی سترھویں تاریخ تھی۔ میں حسب معمول اپنے کمرے میں لیٹی سونے کی کوشش کر رہی تھی۔ عام حالات میں' میں دس بجے تک سو جاتی تھی لیکن اس رات نصف رات گزر جانے کے باوجود نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ رہ رہ کر نہ جانے کیوں مجھے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ آج کوئی انہونی بات ہونے والی ہے۔ رات کے کوئی ساڑھے بارہ یا پون کا عمل رہا ہو گا جب میں اوپری منزل سے شیشے کی تیز جھنکار سنی۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے کوئی وزنی شیشہ ٹوٹ کر چور چور ہو گیا ہے۔ اس رات ہوا کافی تیز تھی۔ اس خیال سے کہ ممکن ہے میرے شوہر نے سونے سے پہلے کھڑکی بند نہ کی ہو جو ہوا کے جھکڑوں سے چوکھٹ کے ساتھ ٹکرائی اور اس کے شیشے ٹوٹ گئے ہوں۔ میں اپنے بستر سے اٹھی اور اوپر جانے کے قصد سے اپنے کمرے سے باہر آ گئی۔ ہر چند کے میرے شوہر نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا کہ میں کبھی اوپری منزل پر قدم نہ رکھوں لیکن کوئی طاقت مجھے جانے کے لئے مجبور کر رہی تھی۔ ڈرتے ڈرتے جب میں نے اوپر جا کر اپنے شوہر کی خوابگاہ میں قدم رکھا تو میرے شوہر وہاں موجود نہیں تھے۔ کمرے میں عجیب سی افرا تفری پھیلی

ہوئی تھی ہر چیز ادھر ادھر بکھری نظر آ رہی تھی۔ میں نے کھڑکی پر نظر ڈالی تو وہ بدستور بند تھی لیکن اس کے شیشے غائب تھے۔ کسی اندرونی خوف سے گھبرا کر جب میں جانے کے ارادے سے پلٹی تو میری نظر اس طرف اٹھ گئی جہاں دیوار پر ایک چوبی تختہ جڑوا کر اس منحوس گدھ کو سجایا گیا تھا جو میرے شوہر مصر سے میرے منع کرنے کے باوجود اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے گدھ کو وہاں سے غائب دیکھا۔ خوف کے مارے میرا سارا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ میں ہانپتی کانپتی نیچے آ گئی۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور میں حیرت میں ڈوبی منحوس گدھ اور اپنے شوہر کی گمشدگی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ میرے ذہن میں برے برے وسوسے آ رہے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں کب تک جاگتی رہی۔ لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ صبح ہونے سے کچھ پیشتر میں نے اوپر جانے والی سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آواز سنی تھی۔ میں نے اپنی خوابگاہ کی ایک کھڑکی سے جھانک کر زینوں کی سمت دیکھا تو خوف اور دہشت کے مارے میرے جسم کے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

وہ شخص جو زینوں پر جا رہا تھا میرا شوہر ہی تھا۔ اس کے جسم پر وہی سیاہ سوٹ تھا جسے اس نے دن میں پہن رکھا تھا لیکن اس وقت سوٹ کی حالت نہایت ابتر نظر آ رہی تھی۔ دوسری بات جو میرے لئے انتہائی حیرت انگیز تھی وہ منحوس گدھ تھا جو میرے شوہر کے کندھے پر بالکل کسی زندہ گدھ کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ میں گنگ سی کھڑی یہ سب کچھ پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتی رہی پھر جب میرے شوہر آخری زینے پر پہنچ کر اپنے کمرے کی طرف جانے کے لئے گھومے تو اوپری راہداری میں جلنے والے مدھم پاور کے بلب کی روشنی میں مجھے اپنے شوہر کا چہرہ نظر آیا جس پر سیاہ اور لمبے لمبے بال اگے ہوئے تھے اور آنکھیں دہکتے انگاروں کی طرح روشن تھیں۔ ان کے دونوں ہاتھوں پر بھی گھنے بال نظر آ رہے تھے اور ہاتھوں کی انگلیاں کسی عقاب کے پنجوں سے مشابہت رکھتی تھیں۔ دہشت کے مارے میں بیہوش ہو گئی۔

دوسری صبح جب میرے شوہر ناشتے کی میز پر آئے تو میں نے ان کی آنکھوں میں رات کی سرخی کا دھندلا دھندلا عکس دیکھا جیسے وہ ساری رات ایک منٹ کے لئے بھی نہ سو سکے ہوں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے جب کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشوں کی بابت

پوچھا تو وہ مجھے وحشتناک نظروں سے گھورنے لگے اور پوچھا کہ شیشے کے ٹوٹنے کا حال مجھے کس طرح معلوم ہوا۔ میں نے جلدی سے بہانہ کر دیا کہ مجھے ملازم کے ذریعے اس کا علم ہوا تھا۔ یہ سن کر وہ بولے کہ خبردار اس کا تذکرہ کسی اور سے مت کرنا۔ اس کے بعد وہ ناشتے سے فارغ ہو کر بازار گئے اور نئے شیشے لا کر خود اپنے ہاتھوں سے ٹوٹے ہوئے شیشوں کی جگہ لگا دیا۔

کئی دنوں تک میں پریشان رہی پھر اس خیال سے کہیں میرے شوہر کسی بد روح یا آسیب کے چکر میں نہ پھنس گئے ہوں میں نے اپنے ملازم کو اعتماد میں لیکر اس سے کہا کہ اگر وہ مجھے کسی تعویذ گنڈے کرنے والے عامل سے ملا دے تو میں اسے انعام کے طور پر ایک معقول رقم دوں گی۔ آٹھ دس روز بعد میں شاپنگ کرنے کے بہانے سے اپنے ملازم کے ساتھ بازار گئی پھر وہاں سے اس بزرگ کے یہاں جا پہنچی جس کی اطلاع مجھے اسی روز اپنے ملازم سے ملی تھی۔ عامل نے مجھے جو بات بتائی وہ میرے لئے انتہائی حیرت انگیز اور پریشان کن تھی۔ اس نے مجھے تفصیل بتانے سے گریز کرتے ہوئے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ میرے شوہر کسی آسیب کے چکر میں پھنس گئے ہیں جو ان سے اپنا انتقام لے رہا ہے۔ عامل نے مجھے ایک تعویذ دیا اور کہا کہ میں اسے کسی وزنی چیز کے نیچے دبا دوں۔ اکیس روز کے اندر اندر آسیب فنا ہو جائے گا۔ میں نے بہتیری کوشش کی کہ عالم سے تفصیل دریافت کروں لیکن اس نے مجھے کچھ بتانے سے انکار کر دیا۔

گھر آ کر میں نے وہ تعویذ بڑی احتیاط سے اپنے ملازم کی مدد سے اس آہنی اور وزنی تجوری کے نیچے دبا دیا جو میرے کمرے میں موجود تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میرا خیال تھا کہ اب اکیس روز بعد مجھے تمام پریشانیوں سے نجات مل جائے گی لیکن اسی رات جس روز میں نے وہ تعویذ دبایا تھا۔ رات کے کوئی دو بجے کے قریب کسی نے میرے کمرے کے دروازے کو زور زور سے پیٹنا شروع کر دیا۔ میں گھبرا کر نیند سے بیدار ہوئی۔ دروازہ کھولا تو دیکھا میرے شوہر باہر کھڑے مجھے انتہائی نفرت اور حقارت بھری نظروں سے گھور رہے ہیں پھر جو کچھ ہوا وہ میرے لئے نا قابل یقین تھا۔ میرے شوہر نے اسی وقت تجوری کے نیچے سے تعویذ

نکال کر اسے نذر آتش کیا اور بڑے سخت لہجے میں کہا کہ اگر اب میں نے دوبارہ کبھی گھر سے قدم باہر نکالنے کی کوشش کی یا ان کے نجی معاملات میں کوئی رخنہ اندازی کرنے کی کوشش کی تو وہ مجھے طلاق دیدیں گے۔ اس واقعے کے بعد سے میں اس قدر ڈر گئی تھی کہ میں نے ان باتوں کا تذکرہ پھر کبھی کسی سے نہ کیا اور نہ ہی کبھی اوپری منزل کا قصد کیا۔ سرشام ہی سے سہم کر اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ جاتی تھی۔"

حسن واسطی کی بیوہ نے اپنے بیان میں اس بات پر زور دیا تھا کہ اس نے ہمیشہ چاند کی سترھویں تاریخ کو اپنے مکان کے اندر کبھی شیشہ ٹوٹنے کی اور کبھی دوسری پراسرار آوازیں سنی تھیں۔ اس نے اپنی یادداشت کے ذریعے اس بات کا شبہ بھی ظاہر کیا تھا کہ حسن واسطی نے جس رات اس منحوس گدھ کو فرعون خوفو کے مقبرے کے باہر سے پکڑا تھا غالباً" اس رات بھی چاند کی سترھویں ہی تاریخ تھی۔ حسن واسطی کی بیوہ نے بتایا کہ ایک عرصے سے اس کے شوہر کی یہ کیفیت ہو گئی تھی۔ وہ اس سے سے کھنچا کھنچا رہتا تھا۔ مصر سے واپسی پر اس کی زندگی میں یہ دردناک انقلاب آیا تھا اور اس کا واحد سبب اس کے خیال میں وہ منحوس گدھ تھا۔

پولیس کیس فائل کے آخر میں انسپکٹر خان نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ غالباً" وہ 500 سال پرانا گدھ کوئی آسیبی چکر تھا۔ جس نے حسن واسطی سے اپنی موت کا انتقام لینے کی خاطر اسے دوسروں کو موت کے گھاٹ اتارنے پر مجبور کر دیا تھا۔ انسپکٹر خان نے اپنے قیاس پر مبنی رپورٹ میں یہ بھی درج کیا تھا کہ ممکن ہے آسیبی گدھ حسن واسطی کے ہاتھوں لوگوں کو درندگی کا نشانہ بنانے کے بعد ان کے جسم سے اپنی روح کے لئے غذا حاصل کرتا ہو۔

حقیقت کیا تھی یہ راز آج تک نہیں کھل سکا اور صرف یہی ایک راز کیا۔ اس عالم رنگ و بو میں کتنے مظاہر ایسے ہیں جن کی توجیہ ابھی تک نہیں کی جا سکتی۔ ہمارا کام ان مظاہر سے نمٹنا اور اپنے اپنے طور پر ان کی توجیہہ کرنا ہے۔



دستک

رات کے یہی کوئی گیارہ ساڑھے گیارہ کا عمل رہا ہو گا۔ میں اپنے فرسٹ کلاس کے کیبن میں آرام سے لیٹا ایک دلچسپ ناول کے مطالعے میں محو تھا کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے چونکا دیا۔

"اتنی رات گئے بھلا میرے پاس کون آ سکتا ہے۔" میں نے سوچا پھر کتاب کا صفحہ موڑ کر اسے بند کیا اور اس خیال سے کہ شاید دستک دینے والا میرا کوئی ہم سفر ہو اٹھ کر دروازہ کھول دیا لیکن باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ راہداری میں ہلکی ہلکی روشنی مجھے کچھ عجیب اور پراسرار سی محسوس ہو رہی تھی۔ پوری راہداری سنسان پڑی تھی۔

"دستک دینے والا کون ہو سکتا ہے۔" میں نے تعجب سے سوچا پھر اس خیال سے کہ ممکن ہے کہ وہ آواز میرا وہم ہو۔ میں نے کیبن میں واپس آ کر اسے اندر سے بولٹ کیا اور دوبارہ کتاب اٹھالی۔ ابھی میں بمشکل چار چھ سطریں ہی پڑھ سکا تھا کہ دروازے پر دوبارہ دستک کی آواز سنائی دی۔ اس بار آواز اتنی واضح تھی کہ میں اسے اپنا وہم قرار نہ دے سکا۔ فوری طور پر جو خیال میرے ذہن میں ابھرا وہ یہی تھا کہ ممکن ہے کوئی مجھے پریشان کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

بحری سفر پر روانہ ہوئے مجھے آج چھٹا دن تھا لیکن اس عرصے میں جہاز پر کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا تھا۔ کتاب کا جو حصہ اس وقت میں پڑھ رہا تھا۔ وہ انتہائی دلچسپ تھا۔ چنانچہ جب دوسری بار دروازے پر دستک کی آواز سنی تو میں جھلا کر رہ گیا۔

"کون ہے ————" میں نے قدرے اونچی آواز اور ناخوشگوار لہجے میں پوچھا۔

میرے سوال کے جواب میں دروازے پر کسی نے تیسری بار دستک دی۔ میری

جھلاہٹ غصے میں تبدیل ہو گئی۔ کتاب رکھ کر میں تیزی سے اٹھا اور دروازے کے قریب آ کر اسے کھول دیا لیکن اس بار بھی باہر نکلنے پر مجھے راہداری میں کوئی نظر نہ آ سکا۔ میں اس مذاق پر تلملا اٹھا اور اندر آ کر کیبن کا دروازہ بڑے غصے میں بند کیا۔ اس بار میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک دستک دینے والا مجھے اپنا نام نہ بتائے گا میں کسی قیمت پر ان بے ہودہ دستکوں پر کوئی توجہ نہ دوں گا۔ خواہ دروازہ توڑ ہی کیوں نہ ڈالا جائے۔

بستر پر لیٹ کر میں نے کتاب کھولی اور دوبارہ اس کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ دس منٹ تک مکمل سکوت طاری رہا اور پھر ———— چوتھی بار پھر کسی نامعقول شخص نے اسی انداز میں دستک دی۔

"کھٹ ———— کھٹ ———— کھٹ۔"

کیبن کے دروازے پر پھر کوئی دستک دے رہا تھا۔ میں نے بڑے غصے سے دروازے کی سمت دیکھا یہ سوال بار بار میرے ذہن میں ابھر رہا تھا کہ آخر وہ کون ہے جو مجھے اس طرح تنگ کرنے پر تلا ہوا ہے اور کیوں؟ ابھی میں اس سوال کا کوئی جواب نہ سوچ سکا تھا کہ دروازے پر پھر کھٹ .... کھٹ .... کی آواز ابھری۔ اس بار دستک کی آواز کے ساتھ ہی کسی کی سسکیاں لینے کی آواز بھی آئی۔ باہر جو کوئی تھا وہ غالباً" رو رہا تھا۔ ایک لمحے تک میں ان سسکیوں پر غور کرتا رہا پھر دبے پاؤں اٹھا اور پنجوں کے بل چلتا ہوا دروازے کے قریب آ گیا۔ آہستہ سے میں نے بولٹ کو اس طرح کھولا کہ کوئی آواز نہ پیدا ہو۔ پھر بولٹ کو نیچے گرا کر میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور جھپٹ کر باہر آ گیا لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ راہداری بالکل ویران پڑی تھی۔ میں غصے کے عالم میں اپنا نچلا ہونٹ کاٹنے لگا۔ میرا خون اندر ہی اندر بری طرح کھول رہا تھا۔ اگر دستک دینے والا اس وقت میرے سامنے ہوتا تو میں یقیناً" اس کے ساتھ بری طرح پیش آتا' لیکن اس کی غیر موجودگی میں میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اپنی جھلاہٹ خود اپنے آپ پر اتار دوں۔

ابھی میں دروازے کے قریب کھڑا اپنے ہونٹ چبا ہی رہا تھا کہ سسکیوں کی آواز

دوبارہ ابھری لیکن اس بار یہ آواز راہداری کے اختتام پر عرشے کی طرف سے آئی تھی۔ میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ آواز اس امر کی تصدیق کر رہی تھی کہ کوئی انتہائی کرب اور بے چینی کی کیفیت سے دو چار ہے۔ میں نے کچھ سوچے اور سمجھے بغیر کیبن کے دروازے کو باہر سے بند کیا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا ———— راہداری کو عبور کر کے عرشے پر آ گیا جہاں اس وقت ہر طرف تاریکی ہی تاریکی پھیلی ہوئی تھی ہوا کے خنک جھونکے میرے جسم سے ٹکرائے تو مجھے جھرجھری آ گئی۔ سمندر کی موجوں کا شور اس گھپ اندھیرے میں عجیب پر اسرار لگ رہا تھا۔

میں اندھیرے میں کھڑا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے اطراف میں دیکھ رہا تھا۔ سسکیوں کی آواز میرے آتے ہی بند ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا "دستک دینے والا یقینی طور پر مجھ سے کسی ہمدردی یا مدد کا طلب گار ہے لیکن وہ ہے کہاں؟"

"تم کہاں ہو دوست" میں نے کچھ توقف کے بعد اندھیرے میں ادھر ادھر گھورتے ہوئے پوچھا۔

جواب میں مجھے ہوا کی سائیں سائیں اور موجوں کے شور کے سوا اور کوئی آواز نہ سنائی دی۔ میں عجیب مخمصے میں پھنسا کھڑا تھا اور یہی سوچ رہا تھا کہ میرا اگلا اقدام کیا ہونا چاہیے کہ اچانک دبی دبی سسکیوں کی آواز دوبارہ میرے کانوں سے ٹکرائی۔ اس بار یہ آواز عرشے پر بائیں جانب اس حصے سے ابھری تھی' جہاں لائف بوٹ اور چھوٹی چھوٹی کشتیاں بندھی ہوئی تھیں میں تیزی سے لپکتا ہوا اس حصے کی طرف گیا اور پھر میں نے اندھیرے کے باوجود ایک سائے کو دیکھا جو ایک کشتی کے قریب کھڑا سسکیاں بھر رہا تھا۔

"کون ہو تم؟" حفظ ماتقدم کے طور پر سائے سے کچھ فاصلے پر رک کر میں نے اس سے پوچھا۔

"میں ———— ایک بدنصیب انسان ہوں۔" اس کی آواز میں درد تھا۔

"ہاں ————" اس نے رندھی ہوئی آواز میں مختصراً" جواب دیا۔

"تمہیں مجھ سے کوئی کام ہے۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ "اگر تم اس کشتی کو کھول کر سمندر میں

اتارنے کے سلسلے میں میری مدد کرو تو میں تمام زندگی تمہارا احسان مند رہوں گا۔"

فوری طور پر میں اس کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ مجھے اس کی خواہش پر تعجب ہو رہا تھا۔ آخر وہ اتنی رات گئے اس کشتی کو سمندر میں کیوں اتارنا چاہتا ہے۔" معاً" میرے ذہن میں یہ خیال بڑی سرعت سے ابھرا کہ وہ یقیناً" کوئی غلط قسم کا آدمی ہے جو رات کو تاریکی میں جہاز والوں کی نگاہوں سے بچ کر کسی خاص وجہ سے فرار ہونے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ جس انداز سے وہ مجھے عرشے تک بلانے میں کامیاب ہوا تھا وہ بھی پر اسرار اور مشکوک تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا ------؟" میں نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

"بنی اسوان" اس نے کہا پھر جلدی سے بولا۔ "کیا تم اس کشتی کو کھول کر نیچے اتارنے میں میری مدد کرنے پر تیار ہو؟"

"لیکن کیوں۔" میں نے دل کڑا کر کے کہا۔ "کیا تم جہاز سے فرار ہونا چاہتے ہو؟"

"نہیں -------" اس نے بڑے مضطرب لہجے میں جواب دیا۔ "میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں فرار نہیں ہوں گا۔ تم بس اس کشتی کو کھول کر سمندر میں اتار دو۔"

"مگر کیوں۔" میں نے تعجب سے پوچھا۔ اس کی خواہش مجھے بڑی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔

"اس لئے کہ اس کشتی میں۔" وہ کچھ کہتے کہتے ایک لمحے کے لئے رکا پھر بڑی درد بھری آواز میں بولا۔ "اس کشتی میں ایک لاش موجود ہے .... میری ایک عزیزہ کی لاش۔ میں نہیں چاہتا کہ جہاز کے مسافر اسے دیکھیں .... بولو .... کیا تم اس لاش کو سمندر میں اتارنے میں میری مدد کرو گے۔"

"تو گویا تم قاتل ہو؟" میں نے سہم کر پوچھا۔

"نہیں -------" وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔ "میں نے اسے قتل نہیں کیا بلکہ صرف اس اذیت سے نجات دلا دی جس میں وہ مبتلا تھی۔"

"تم یقیناً" کوئی جنونی قاتل ہو۔" یکلخت میں نے بڑے جوش میں آ کر کہا۔ "اس

سے پہلے کہ تم لاش کو سمند میں اتار کر اپنے ناپاک منصوبے میں کامیاب ہو میں تم کو گرفتار کرا دوں گا۔"

"سنو ------- اگر تم نے شور مچانے کی کوشش کی یا کسی کو میرے بارے میں بتایا تو تمہارا انجام بھی بڑا عبرتناک ہو گا؟"

اس کی آواز میں نہ جانے کیا سحر تھا کہ میں کانپ اٹھا۔ میں نے جواب دینا چاہا لیکن آواز جیسے میرے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ خوف اور دہشت کے مارے میرے جسم کے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ فضا کی خنکی کے باوجود میرا سارا بدن پسینے میں شرابور تھا۔ پھر میں بڑی تیزی سے گھوما اور اندھا دھند اپنے کیبن کی طرف دوڑنے لگا۔ یکلخت تاریکی میں' میں نے کسی چیز سے ٹھوکر کھائی اور اوندھے منہ زمین پر آ رہا۔

○

غنودگی کی حالت میں مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے گرد بہت سارے افراد جمع ہیں اور شور و غل کی آواز ہر لمحے بڑھتی جا رہی ہے۔ چند ثانیے تک میں آنکھیں بند کئے اپنے ذہن کی منتشر قوتوں کی یکجا کرتا رہا پھر ایک دم ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ کوئی میرے کیبن کے دروازے کو زور زور سے پیٹ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ باہر سورج کی روشنی دیکھ کر مجھ پہلی بار احساس ہوا کہ دن خاصا چڑھ آیا ہے اور میں خلاف معمول دیر تک سوتا رہا ہوں۔ تعجب کی دوسری بات میرے لئے میجر رحمان اور اس کی خوبصورت بیوی کی موجودگی تھی جو میرے کیبن کے سامنے حیران و پریشان کھڑے تھے۔

قبل اس کے کہ میں واقعات کے تسلسل کو جاری رکھوں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میجر رحمان بحری سفر میں محض تین روز قبل میرا ہم سفر بنا تھا۔ میرے کیبن سے ملے ہوئے دو کیبن اس کے تصرف میں تھے ایک وہ اپنی نوجوان' حسین و جمیل بیوی ریحانہ کے ساتھ مقیم تھا اور دوسرا کیبن اس کی سالی فرزانہ اور دو لڑکوں انجم اور پرویز کے لئے وقف تھا۔ انجم کی عمر سات سال تھی اور پرویز پانچ سال کا تھا۔ پہلی بات جو میرے لئے مختصر سے خاندان کی طرف توجہ کا باعث بنی ------- تھی وہ

ریحانہ اور فرزانہ کی حیرت انگیز مشابہت تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت زیادہ ملتی جلتی تھیں۔ چہرے کے سلسلے میں بھی دونوں کا ذوق یکساں تھا۔ ایک فرق جو میں نے ان تین دنوں میں محسوس کیا تھا وہ یہ تھا کہ ریحانہ زیادہ تر سنجیدہ اور اپنے خیالوں میں ڈوبی نظر آتی تھی۔ اس کے برعکس فرزانہ بے حد ہنس مکھ اور ملنسار طبیعت کی لڑکی تھی۔

میجر رحمان کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا کہ وہ حد درجہ تنک مزاج اور اکھڑ قسم کا آدمی تھا۔ غیر متعلقہ لوگوں سے ملتے وقت اس کی کشادہ پیشانی پر ناگواری کی آڑی ترچھی سلوٹیں ابھری رہتی تھیں پہلی ملاقات میں' میں نے اس کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی اور فیصلہ کرلیا تھا کہ آئندہ اس سے الگ تھلگ ہی رہا کروں گا۔ چنانچہ اس وقت جب میں نے اسے اپنے کیبن کے دروازے پر ریحانہ کے ساتھ دیکھا تو اپنے چہرے سے کسی خوشی کا اظہار کرنے کے بجائے اسے وضاحت طلب نظروں سے گھورنے لگا۔

"مسٹر طارق۔ میں اس وقت آپ کے آرام میں مخل ہونے کی معافی چاہتا ہوں۔ لیکن کیا آپ نے فرزانہ کو کہیں دیکھا ہے۔" میجر نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"جی نہیں ------" میں نے جان بوجھ کر خشک انداز میں کہا۔ "اگر آپ دستک دے کر مجھے بیدار نہ کرتے تو شائد میں ابھی مزید کچھ دیر تک سویا رہتا۔ رات سے میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"پھر وہ گئی کہاں۔" میجر نے خلا میں گھورتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی جھلاہٹ اس بات کی ترجمانی کر رہی تھی کہ وہ کسی ذہنی الجھن کا شکار ہے اور وہ الجھن یقینی طور پر فرزانہ کی ذات سے وابستہ تھی۔ جس کے بارے میں مجھ سے دریافت کیا گیا تھا۔

میں نے جان بوجھ کر میجر کی الجھن کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور واپسی کے ارادے سے پلٹنا ہی چاہتا تھا کہ ریحانہ نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

"مسٹر طارق ------ میری بہن فرزانہ اچانک نہ جانے کہاں گم ہو گئی ہے۔ ہم لوگوں نے اسے تلاش کرنے کی تمام کوشش کر ڈالی۔ لیکن اس کا کوئی سراغ

نہیں ملا اور اب ------"

"اب آپ نے اپنی بہن کو تلاش کرنے کی خاطر سب سے پہلے غالباً" میرے کیبن کا انتخاب کیا ہے۔" میں نے قدرے ترش لہجے میں جواب دیا۔

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں طارق صاحب۔" ریحانہ نے جلدی سے کہا۔ "ہم نے ایک پڑوسی کے رشتے سے آپ کو اپنی پریشانی میں شریک کرنے کا فیصلہ کیا تھا ورنہ ہمیں خدانخواستہ آپ پر کسی قسم کا شبہہ نہیں ہے۔ بات چونکہ ایک لڑکی کی ہے اس لئے ہم اس کی تشہیر سے ڈر رہے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ آپ کی ہمشیرہ اس وقت اپنے کسی واقف کار کے کیبن میں موجود ہو۔" میں نے اس دفعہ قدرے نرمی سے کہا۔ "کیا آپ نے اپنے واقف کاروں سے دریافت کرلیا ہے۔"

"پریشانی کی بات تو یہی ہے کہ جہاز پر ہمارا کوئی واقف کار نہیں ہے۔" ریحانہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر اپنے شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا آپ نے صبح سے اسے نہیں دیکھا۔" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"جی نہیں۔"

"بچوں نے کیا بتایا؟"

"کچھ بھی نہیں۔" ریحانہ نے آبدیدہ ہو کر جواب دیا۔ "بچے جب صبح سو کر اٹھے تو انہوں نے فرزانہ کو کیبن میں نہیں پایا۔"

"چلو ریحانہ۔" یکلخت میجر رحمان نے اپنی بیوی کو مخاطب کر کے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔ "کچھ دیر اور فرزانہ کا انتظار کرتے ہیں۔ اس کے بعد مجبوراً" ہمیں جہاز کے کپتان سے مدد لینی پڑے گی۔"

میجر اور ریحانہ چلے گئے تو میں واپس اپنے کیبن میں آگیا ------ مجھے گزشتہ رات والی باتیں یاد آگئیں جو خواب کی سی کیفیت میں میرے ساتھ پیش آئی تھیں۔ چند لمحے میں گنگ سا کھڑا رات والے پر اسرار اور ڈراؤنے خواب کے بارے میں سوچتا رہا پھر جلدی جلدی میں نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے تبدیل کئے اور ناشتے سے فراغت پا کر عرشے پر آگیا۔ جہاں ہر طرف دھوپ کھلی ہوئی تھی۔

عرشے پر ریلنگ کے سہارے کھڑا کچھ دیر تک میں یونہی حد نظر تک پھیلے ہوئے سمندر کی بے قرار موجوں کو تکتا رہا لیکن اس عرصے میں میری نظریں متعدد بار اس کشتی کی طرف اٹھی تھیں جو عرشے پر بائیں جانب موجود تھی اور جسے کل رات میں خواب میں دیکھ چکا تھا۔ میں اس وقت اس کشتی کو ایک نظر اندر سے دیکھ لینے کے لئے بے چین تھا جس کے بارے میں مجھے خواب میں نظر آنے والے بنی اسوان نے یہی بتایا تھا کہ اس کے اندر اس کی عزیزہ کی لاش موجود ہے۔ ہرچند کہ میرے نزدیک خواب کی باتوں کا عام زندگی سے کوئی تعلق بیکار تھا۔ پھر بھی فرزانہ کی گمشدگی کی خبر سن لینے کے بعد میرا اضطراب بڑھ گیا تھا۔ عرشے پر اس وقت میرے علاوہ دوسرے مسافر بھی موجود تھے۔ ان کی موجودگی میں کسی اونچے مقام پر چڑھ کر مطلوبہ کشتی کے اندر جھانکنا یقیناً" ایک مضحکہ خیز حرکت ہوتی۔ چنانچہ میں بڑی دیر تک اس کشتی کو ایک نظر اندر سے دیکھ لینے کے منصوبے بناتا رہا۔

ابھی میں اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے کوئی طریقہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک چیخ و پکار کی آواز سن کر چونک اٹھا۔ تیزی سے گھوم کر میں نے جہاز کے اس خلاصی پر نظر ڈالی جو غالباً" کسی ضرورت کے تحت اوپر چڑھا تھا اور اب ہذیانی انداز میں اسی کشتی کی طرف ہاتھ ہلا ہلا کر چلا رہا تھا جس کی نشاندہی مجھے خواب میں کی گئی تھی۔ خلاصی کی چیخ و پکار سن کر جہاز کے عملے کے افراد کے علاوہ مسافروں کی اچھی خاصی تعداد بھی اس حصے میں آکر جمع ہو گئی جہاں وہ کشتی موجود تھی۔

جہاز کے سیکنڈ آفیسر نے خلاصی سے اس کے شور و غل کی وجہ دریافت کی۔ پھر جب اس کشتی کو کھول کر عرشے پر اتارا گیا تو لوگوں میں کھلبلی مچ گئی کشتی کے اندر فرزانہ کی مسخ شدہ لاش موجود تھی۔ لاش پر نظر پڑتے ہی میں خوف سے کانپ اٹھا۔ دہشت کے مارے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں کسی بے جان بت کی طرح کشتی کے قریب کھڑا فرزانہ کی لاش کو گھورے جا رہا تھا جسے بڑی بیدردی سے قتل کیا گیا تھا۔ اس کے جسم کے عریاں حصوں پر جابجا گہرے نیل پڑے تھے۔ ننگے بازوؤں پر کئی جگہ سے کھال ادھڑی سی نظر آ رہی تھی جس کے گرد گاڑھا خون جم گیا تھا۔ چہرے کی حالت اس قدر دہشت انگیز تھی کہ دیکھنے والوں کے حلق سے بھی چیخیں نکل

گئیں۔ قاتل نے غالباً" فرزانہ کو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا تھا۔ اس بات کا خیال مجھے مقتولہ کی آنکھیں دیکھ کر ہوا جو اپنے حلقوں سے باہر ابل آئی تھیں۔

کشتی کے اطراف مسافروں کا ہجوم ہر لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ فرزانہ کے قتل کی خبر آگ کی طرح پورے جہاز پر پھیل چکی تھی۔ میجر رحمان کی کیفیت اس وقت بھی مجھے کسی ٹھہرے ہوئے طوفان جیسی نظر آ رہی تھی وہ کشتی کے قریب کھڑا پھٹی پھٹی نگاہوں سے لاش کو ٹکٹکی باندھے گھور رہا تھا۔ البتہ ریحانہ کی حالت قابل رحم تھی۔ بہن کی لاش کو دیکھ کر وہ ماہی بے آب کی طرح پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ جہاز کی چند مسافر خواتین نے اگر بروقت اسے سنبھال نہ لیا ہوتا تو عین ممکن تھا کہ وہ بھی کشتی سے سر ٹکرا ٹکرا کر جان دے دیتی۔ میجر رحمان کے دونوں لڑکے انجم اور پرویز حیرت زدہ کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ جہاز کے کپتان کو اس صورت حال پر قابو پانے میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑا لیکن کسی نہ کسی طرح اس نے بڑی خوبصورتی سے مسافروں کو سمجھا بجھا کر وہاں سے ہٹایا اور میجر رحمان کو علیحدہ لے جا کر کچھ باتیں کرنے لگا۔ میں چونکہ دور کھڑا تھا۔ اس لئے میجر رحمان اور جہاز کے کپتان کے درمیان ہونے والی گفتگو نہ سن سکا۔

فرزانہ کی لاش دستیاب ہونے کے کوئی چار گھنٹے بعد اسے ضروری رسوم کی ادائیگی کے بعد بحری قانون کے مطابق سمندر کی بے تاب موجوں کے حوالے کر دیا گیا۔ جس وقت لاش کو نیچے اتار جا رہا تھا اس وقت میجر رحمان نے ریحانہ کو بازوؤں سے تھام رکھا تھا۔ مبادا کہ وہ فرط غم سے سمندر میں چھلانگ لگا دے۔

○

دو روز تک شب و روز جہاز کا عملہ فرزانہ کے پر اسرار قتل کے سلسلے میں تحقیق و تفتیش میں مصروف رہا لیکن کوئی قابل توجہ بات ان کے علم میں نہ آ سکی ان دو دنوں میں میرے ذہن میں ہر وقت یا تو بنی اسوان کا نام گونجتا رہتا یا پھر فرزانہ کے قتل سے پہلے رات کو میں نے جو بھیانک خواب دیکھا تھا اس کے مناظر میری آنکھوں کے سامنے گردش کرتے رہتے۔ اپنے طور پر میں نے جہاز پر موجود مسافروں کے ناموں

کی وہ فہرست بھی دیکھ ڈالی جو عملے کے ایک ذمے دار افسر کے پاس موجود تھی لیکن بنی اسوان کا نام مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے قاتل نے مجھے اپنا نام غلط بتایا ہو۔

ایک دو بار میرے ذہن میں یہ خیال بھی ابھرا کہ تنہائی میں ریحانہ سے مل کر بنی اسوان کے بارے میں دریافت کیا جائے لیکن ہمت نہ ہوئی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ میجر رحمان ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ لگا رہتا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ بنی اسوان کے وہ جملے اب تک میرے ذہن میں محفوظ تھے جو اس نے خواب کی کیفیت میں مجھ سے کہے تھے۔

"سنو ——— اگر تم نے شور مچانے کی کوشش کی یا کسی کو میرے بارے میں بتایا تو تمہارا انجام بھی بڑا عبرتناک ہو گا۔"

میں اپنے کیبن میں بیٹھا انہی پریشان خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ اچانک دروازے پر ہونے والی دستک نے میرے خیالات کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

"طارق صاحب میرے شوہر کی حالت اچانک بہت خراب ہو گئی ہے۔ اگر زحمت نہ ہو تو آپ جہاز کے ڈاکٹر کو بلا دیں۔"

"میں ابھی ڈاکٹر کو ساتھ لے کر آتا ہوں۔" میں نے ریحانہ کے سوگوار حسن کو غور دیکھتے ہوئے کہا پھر قدم بڑھاتا تیزی سے ڈاکٹر کے کیبن کی طرف چلا گیا۔

پانچ منٹ بعد میں ڈاکٹر کو ساتھ لئے میجر رحمان کے کیبن میں داخل ہوا جو اپنے بستر پر آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ پہلی نظر میں اسے دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ برسوں کا مریض ہے۔ اس کے چہرے پر زردی پھیلی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمایاں ہو گئے تھے اور سانس رک رک کر چلتا محسوس ہو رہا تھا۔ میجر کی یہ حالت دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی ——— اس لئے کہ دوپہر کو جب میں نے اسے ڈائننگ روم میں دیکھا تھا تو وہ بے حد تندرست و توانا نظر آ رہا تھا۔ اس کے بھرے بھرے چہرے پر چھلکنے والی سرخی میرے لئے قابل رشک تھی لیکن اس وقت اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔

جہاز کے ڈاکٹر کی آنکھوں میں بھی میں نے الجھن دیکھی تھی۔ بہرحال ڈاکٹر بڑی توجہ سے اس کا معائنہ کرتا رہا اور میں اس کے قریب کھڑا اس کی ایک ایک حرکت کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ معائنے سے فارغ ہو کر ڈاکٹر نے فوری طور پر میجر رحمان کو ایک انجکشن لگایا پھر ضروری دوائیں لکھ کر باہر آ گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ باہر آ گیا تھا۔

"ڈاکٹر———" میں نے کچھ دور آنے کے بعد اسے مخاطب کیا۔ "میجر رحمان کی زندگی کو کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ چند گھنٹوں سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے گا۔" ڈاکٹر چلتے چلتے یکلخت رک گیا اور تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ "آج تک میری نظروں سے کوئی ایسا مریض نہیں گزرا جس کے جسم کا سارا خون محض چند گھنٹوں میں یوں خشک ہو گیا ہو۔ یا غائب ہو گیا ہو۔"

"میں سمجھا نہیں ڈاکٹر۔" میں نے ڈاکٹر کو حیرت بھری نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی تین گھنٹے پہلے ہی کی بات ہے جب میں نے میجر کو کھانے کی میز پر دیکھا تھا۔ اس وقت وہ اچھا خاصا تھا لیکن اب ——— یوں لگتا ہے جیسے کسی نے اس کے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔"

"کیا میجر کو بچانے کی کوئی صورت نہیں ہے۔" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"صرف ایک صورت ہے۔ اسے کافی مقدار میں خون فراہم کیا جائے لیکن۔"

"لیکن کیا ڈاکٹر" ڈاکٹر کی خاموشی نے نہ جانے کیوں میرے دل کی دھڑکنیں تیز کر دیں۔

"ہمارے پاس اتنا خون موجود نہیں ہے جو میجر کی زندگی بچا سکے۔"

قبل اس کے کہ میں ڈاکٹر کی بات کا کوئی جواب دیتا میرے کانوں میں ریحانہ کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ میں نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اپنے کیبن کے دروازے کے قریب کھڑی مجھ سے کہہ رہی تھی۔

"جلدی آیئے مسٹر طارق ——— میرے شوہر کو نہ جانے کیسا دورہ پڑا ہے۔"

میں بھاگتا ہوا اس کے کیبن میں گیا تو دیکھا کہ میجر رحمان کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر ابلی پڑی رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے۔ پورا جسم یوں کانپ رہا تھا جیسے اسے بجلی کے ننگے تاروں پر لٹا دیا گیا ہو۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جس سے دہشت جھلک رہی تھی کیبن کی چھت کو گھورے جا رہا تھا۔ اچانک اس کے حلق سے بے ربط جملے ٹوٹ پھوٹ کر نکلے۔

"چلے جاؤ ——— تم .... ناپاک اور گندے وجود .... میں تمہیں شوٹ کر دوں گا .... مردود .... چھوڑ .... خدا کے لئے چھوڑ مجھے .... آہ .... آہ .... آہ۔"

میں عجیب شش و پنج میں مبتلا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میرے قریب ہی جہاز کا تجربہ کار ڈاکٹر بھی موجود تھا' لیکن اس سے پیشتر کہ ہم میجر کو پڑنے والے اس دورے کا تدارک کرتے وہ کسی زندہ لاش کی طرح اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ریحانہ خوف کے مارے چیخ پڑی۔ ڈاکٹر سہمے ہوئے انداز میں دور ہٹ گیا۔ میرے وجود پر ایک نامعلوم سی دہشت طاری ہو رہی تھی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے میجر کے اکڑے ہوئے جسم نے دو تین شدید جھٹکے کھائے۔ پھر وہ اندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر اس کی نبض ٹٹولی۔ ایک نظر مجھ پر ڈالی پھر بستر کی چادر اتار کر میجر کے اوپر ڈال دی۔ گویا یہ اس بات کا اعلان تھا کہ میجر کی روح اس کے قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔

ریحانہ میرے قریب کھڑی اب تک خوف سے کپکپا رہی تھی۔ لیکن جب اسے حالات کی نوعیت کا احساس ہوا تو وہ ہذیانی انداز میں چیختی ہوئی اپنے شوہر کی لاش سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔

اسی روز رات کی تاریکی میں میجر رحمان کی لاش کو بھی ضروری رسوم کے بعد ایک چرمی تھیلے میں بند کر کے سمندر کی بے چین لہروں پر چھوڑ دیا گیا۔

فرزانہ اور اس کے بعد میجر رحمان کو پیش آنے والے اس اندوہناک حادثے کو تین روز گزر چکے تھے ریحانہ نے پرویز اور انجم کو اپنے کیبن میں رکھ لیا اور دوسرا کیبن خالی کر دیا۔ ان دونوں حادثات کی وجہ سے وہ ہر وقت سہمی سہمی سی نظر آتی

تھی۔ اپنے دونوں بیٹوں کو وہ ایک پل کے لئے بھی اپنی نگاہوں سے دور نہ ہونے دیتی اور سرشام ہی انہیں اپنے کیبن میں بند ہو کر کے بیٹھ جاتی تھی۔ جہاز پر میرے سوا وہ کسی اور سے واقف نہیں تھی۔ چنانچہ جب بھی کوئی موقع ہاتھ آتا میں اسے جھوٹی تسلیاں دے کر بہلانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

ایک بات جو ہر وقت میرے ذہن میں کلبلاتی رہتی وہ بنی اسوان کی شخصیت تھی جو محض ایک بار خواب کی کیفیت میں میرے سامنے آئی تھی۔ میں جاننے کے لئے بے چین تھا کہ آخر وہ کون ہے؟ فرزانہ کی موت سے اس کا کیا تعلق تھا؟ اور میجر کی موت سے اسے کس قسم کی تسکین حاصل ہوئی تھی؟ .... ایک بار میرے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ کیوں نہ میں براہ راست ریحانہ سے اس کے بارے میں دریافت کروں لیکن یہ سوچ کر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا کہ "اس کا غم ابھی تازہ ہے۔ ممکن ہے میرے استفسار پر اسے مزید کسی ذہنی صدمے سے دوچار ہونا پڑے۔" دوسرا سبب میری خاموشی کا یہ تھا کہ بنی اسوان نے مجھے اپنے بارے میں زبان بند رکھنے کی سختی سے ہدایت کی تھی اور یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ اگر اس سلسلے میں' میں نے زبان کھولی تو اس کے نتائج میرے حق میں خطرناک ثابت ہوں گے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہمہ وقت میرے ذہن میں یہ سوال کلبلاتا رہتا تھا کہ۔

"آخر وہ کون تھا؟"

اس وقت بھی جب میں کھانے سے فراغت پا کر کچھ دیر کے لئے آرام کی غرض سے اپنے کیبن میں آیا تو میرے ذہن میں یہی سوال تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اس سوال کو ذہن سے جھٹک دوں لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ واقعات نے جس انداز میں مجھے اس خوفناک کہانی کا جزو بنا دیا تھا۔ اس سے چھٹکارا پانا شاید میرے بس کی بات نہیں تھی۔

بڑی دیر تک میں اپنے بستر پر لیٹا انہی خیالات میں غرق رہا پھر نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی اور میں نیند کی آغوش میں سمٹ کر رہ گیا۔ دوسری بار جب میری آنکھ کھلی تو کیبن میں گہری تاریکی مسلط تھی۔ میں نے اٹھ کر لائٹ جلائی پھر گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا کہ میں پورے سات گھنٹے تک سوتا رہا ہوں۔ اس وقت رات کے نو بج

رہے تھے۔ میں نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے تبدیل کئے پھر ریکریشن روم تک جانے کے ارادے سے قدم اٹھائے ہی تھے کہ دروازے پر ہونے والی دستک سن کر ٹھٹھک گیا۔ ایک لمحے کے لئے میں اپنی جگہ ساکت کھڑا خوفزدہ نظروں سے دروازے کو گھورتا رہا۔ پھر دوسری بار جب دستک ہوئی تو میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور ریحانہ کو تعجب خیز نظروں سے دیکھنے لگا جو حیران پریشان سی میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف اور الجھن کے ملے جلے تاثرات تھے۔ آنکھوں سے دہشت جھانک رہی تھی اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں ریحانہ کو اس حالت میں دیکھ کر فوری طور پر میرے ذہن میں یہی خیال ابھرا کہ وہ یقیناً" کسی صدمے کی کیفیت سے دو چار ہوئی ہے۔ چنانچہ میں نے پوچھا:

"خیریت ------- آپ کچھ پریشان نظر آ رہی ہیں۔"

"طارق صاحب -------- وہ .... وہ ...." وہ اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکی اور اپنے کیبن کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے کی رنگت زرد پڑتی جا رہی تھی۔

"آپ کے بچے تو خیریت سے ہیں۔" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ لیکن وہ .... وہ پرویز کے سرہانے بیٹھا ہے۔" ریحانہ نے خوف سے کانپتی آواز میں کہا۔

"وہ کون؟" میں نے برجستہ سوال کیا۔

"طارق صاحب .... مجھے بچا لیجئے .... میں ...."

اگر میں نے لپک کر ریحانہ کو اپنے بازوؤں کا سہارا نہ دیا ہوتا تو وہ یقیناً" فرش پر گر جاتی .... کسی شدید صدمے کے زیر اثر وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ میں اسے ہاتھوں پر اٹھائے اس کے کیبن میں آیا تو وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ حالانکہ ریحانہ نے ابھی ایک منٹ پہلے ہی مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں اسے اس شخص سے بچا لوں جو اس کے کیبن میں پرویز کے سرہانے بیٹھا تھا۔

ریحانہ کو اس کے بستر پر لٹا کر میں نے دونوں بچوں پر نظر ڈالی جو محو خواب تھے۔ اس خیال کے تحت کہ کہیں کوئی باتھ روم کے اندر نہ چھپا بیٹھا ہو۔ میں نے وہاں بھی

دیکھا مگر کوئی نظر نہ آیا۔ اس بات کا اطمینان کر لینے کے بعد کہ کیبن میں کوئی شخص موجود نہیں ہے میں دوڑا دوڑا گیا اور ڈاکٹر کو ساتھ لے آیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد صرف اتنا ہی کہا تھا کہ بے ہوشی کی وجہ کوئی ذہنی صدمہ ہے۔ ریحانہ کو اس نے ضروری دوائیں دیں اور رخصت ہو گیا۔ میں نے باہر آ کر اپنے کیبن کو مقفل کیا پھر ریحانہ والے کیبن میں آ کر اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں بھی سہمی سہمی اور خوفزدہ دکھائی دے رہی تھی۔ پھر میرے ذہن میں ایک وسوسے نے سر ابھارا۔

"کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ریحانہ اپنی بہن کی جوان موت اور شوہر کی جدائی کے صدمے سے اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی ہو اور بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔" میں بڑی دیر تک اسی مسئلے پر غور کرتا رہا۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد ریحانہ کو دوبارہ ہوش آیا۔ مجھے اپنے قریب بیٹھا دیکھ کر اس کے چہرے پر سکون کی ایک لہر آ کر تیزی سے گزر گئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور بچوں کی طرف دیکھنے لگی۔ میں اس کی ایک ایک حرکت کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن کی جھلکیاں دیکھ کر میں نے دبی زبان میں کہا۔

"یہاں میرے سوا کوئی اور نہیں ہے۔"

"تو کیا وہ چلا گیا۔"

"آپ کس کے بارے میں پوچھ رہی ہیں۔"

"وہی -------- بنی اسوان۔" ریحانہ نے کپکپاتی آواز میں جواب دیا۔

"بنی اسوان' .... میرے ذہن میں ایک جھناکا سا ہوا ---------- یہ وہی نام تھا جو مجھے پریشان کئے ہوئے تھا۔ ریحانہ کے منہ سے بنی اسوان کا نام سن کر میرے اعصاب میں کھنچاؤ سا پیدا ہونے لگا۔ میں نے سوچا -------- اگر ریحانہ نے بنی اسوان کو اپنے کیبن میں دیکھا تو وہ یقیناً" اسی جہاز پر موجود ہے اور اس صورت میں' میں بہ آسانی اسے تلاش کر کے اس سے فرزانہ کی موت اور میجر کے حیرت ناک انجام کے بارے میں باز پرس کر سکتا ہوں۔ میں نے دل ہی دل میں اس بات کا فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ بنی اسوان کے نظر آتے ہی اسے کپتان کی تحویل میں بطور قاتل پیش کر دوں

گا تاکہ وہ ریحانہ یا اس کے بچوں کو اپنی کسی نا معلوم دیوانگی کا نشانہ بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

"کیا آپ بنی اسوان کے بارے میں مزید کچھ بتانا پسند کریں گے۔" میں نے دبی زبان میں پوچھا۔

ریحانہ نے فوراً ہی کوئی جواب نہ دیا۔ الجھن اور پریشانی کے تاثرات اس کے چہرے سے صاف عیاں تھے۔ کچھ دیر تک وہ نظریں جھکائے خاموش بیٹھی رہی پھر اس نے بڑی مدھم اور مضمحل آواز میں کہنا شروع کیا۔

"اس بات کو ایک طویل مدت گزر چکی ہے۔ تقریباً آٹھ سال پہلے کی بات ہے جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ ان دنوں میں اپنے والد کے ساتھ اہرام دیکھنے کے شوق میں مصر گئی تھی۔ ہمارا قیام ایک ہوٹل میں تھا۔ یہیں میری اور بنی اسوان کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ایک مقامی تاجر کا اکلوتا لڑکا تھا بے حد ملنسار، خوش گفتار اور مردانہ وجاہت کا نمونہ۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت ہم لوگوں کی صحبت میں گزارتا اور ہمیں اپنی خوبصورت اور لمبی چوڑی کار میں سارا سارا دن ساتھ لئے مصر کے تاریخی مقامات کی سیر کرایا کرتا ________ رفتہ رفتہ ہم ایک دوسرے سے بہت زیادہ بے تکلف ہو گئے اور پھر یہ بے تکلفی محبت میں دل گئی۔ اس نے مجھے بارہا تنہائی میں یہ بات باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ میرے یر وہ زندہ نہیں رہ سکتا اور ہر قیمت پر مجھے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

"ایک روز باہم مشورے کے بعد اس نے والد صاحب کے سامنے اپنی اس اہش کا اظہار بھی کر دیا میرا اندازہ تھا کہ والد صاحب اسے بغیر کسی جھجک کے رے لئے قبول کر لیں گے، لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ وہ بنی اسوان کی خواست سنتے ہی آگ بگولا ہو گئے اور بڑی سختی سے اسے یہ کہہ کر دھتکار دیا کہ وہ ارہ کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرے۔ اس کے جانے کے بعد مجھے بھی سخت ظ کہے گئے۔ ہمارا پروگرام مصر کے بعد فرانس جانے کا تھا لیکن والد صاحب اس قعے سے کچھ ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ دوسرے ہی دن انہوں نے واپسی کے لئے ے میں اپنی سیٹ بک کرائی اور مجھے ساتھ لے کر واپس آ گئے۔"

ریحانہ نے ایک لمحے کے لئے اپنی یادداشت کو کریدا پھر ایک سرد آہ بھر کر بولی۔

"وطن واپس آتے ہی انہوں نے اپنے ایک قریبی دوست کے لڑکے میجر رحمان سے میری شادی کر دی۔ شادی کے دو سال تک مجھے بنی اسوان کے بارے میں مطلق کوئی خبر نہ مل سکی۔ میں میجر کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی تھی لیکن دو سال بعد اچانک ایک روز مجھے بنی اسوان کا ایک خط ملا، جس میں اس نے میری بے وفائی کا گلہ کیا تھا۔ میں نے اس خط کو اپنے شوہر سے چھپائے رکھا اور بنی اسوان کو نہ صرف یہ کہ اپنی شادی کی خبر سے مطلع کر دیا بلکہ بڑی سختی سے یہ بھی تاکید کر دی کہ آئندہ وہ مجھ سے خط وکتابت نہ کرے۔

"اس کے بعد مجھے بنی اسوان کی کوئی اطلاع نہیں ملی نہ ہی اس نے مجھے دوسرا کوئی خط لکھا۔ میں اپنی جگہ مطمئن تھی کہ اب یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ شادی کے چھ سال بڑی ہنسی خوشی سے بیت گئے۔ میرے شوہر کو مجھ پر پورا پورا اعتماد تھا لیکن یہ اعتماد بھی ایک روز بنی اسوان کی وجہ سے ختم ہو گیا۔

"ایک روز میں گھر میں تنہا کام کاج میں مصروف تھی کہ میرے ملازم نے کسی کی آمد کی اطلاع دی .... یہ سوچ کر کہ آنے والا میرے والد یا شوہر کا کوئی واقف کار ہو گا۔ میں ملازم کو کام سونپ کر خود باہر آ گئی۔ لیکن جس وقت میں نے آنے والے کو دیکھا تو اچانک گھبرا گئی۔ میرے سامنے بنی اسوان موجود تھا۔ وہ مجھے بے حد کمزور اور لاغر نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں کے اندر دھنس گئی تھیں۔ اس نے میلے کچیلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ سر کے بال جسے وہ ہمیشہ بڑے سلیقے سے جمانے کا عادی تھا بری طرح بڑھے ہوئے تھے اور جھاڑ جھنکاڑ کی طرح بکھرے بکھرے نظر آ رہے تھے اس کے چہرے سے وحشت اور دیوانگی ٹپک رہی تھی۔ کچھ دیر میں ہکا بکا کھڑی اسے گھورتی رہی پھر بڑی سختی سے میں نے اسے اپنی عمارت سے نکل جانے کا حکم دیا۔ میرا خیال تھا کہ میری بے رخی اور ترش روئی اسے واپس چلے جانے پر مجبور کر دے گی لیکن وہ بدستور دروازے سے لگا کھڑا مجھے گھورتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں شکوہ تھا۔ میں اس ڈھٹائی پر اور زیادہ برہم ہو گئی۔ میں نے اسے دھمکی دی کہ اگر وہ فوراً نہ چلا گیا تو میں ملازم کو آواز دے کر بلا لوں گی لیکن قبل اس کے میں اپنی بات کو عملی

جامہ پہناتی میرے والد آ گئے۔ انہوں نے بنی اسوان کو پہچانا تو آپے سے باہر ہو گئے۔ اور اسے دھکے دے کر نکلوا دیا .... میں خاموشی سے سر جھکائے اپنے کمرے میں آ گئی۔ کچھ دیر بعد والد صاحب آئے اور مجھ پر برہم ہونے لگے۔ ان کو شبہ تھا کہ شاید بنی اسوان وہاں میری ایما پر آیا تھا اور میں اس سے اب بھی ملتی رہتی ہوں۔

"میں نے والد صاحب کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی سب کچھ سنتی رہی والد صاحب کافی دیر تک مجھ پر برہم ہوتے رہے۔ پھر انہوں نے مجھے نرمی سے سمجھایا کہ اگر میرے شوہر کو ان باتوں کا علم ہو گیا تو وہ کیا سوچیں گے۔"

ریحانہ ایک لمحے کے لئے رکی پھر اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"جس وقت والد صاحب مجھے حالات کی اونچ نیچ سمجھا رہے تھے۔ اس وقت میرے شوہر بھی آ گئے۔ انہوں نے باہر سے تمام باتیں سن لی تھیں۔ والد صاحب کے کمرے سے جانے کے بعد وہ میرے پاس آئے اور مجھ سے بڑے تلخ لہجے میں بنی اسوان کے بارے میں سوالات کرنے لگے۔ میں نے حتی الامکان انہیں سمجھانے کی کوشش کی اور اپنی بے گناہی کا یقین دلانا چاہا۔ مگر انہیں کسی طرح یقین نہ آیا۔ اس دن سے ان کے رویئے میں تبدیلی آ گئی۔ ان کی محبت جھلاہٹ اور چڑ چڑے پن میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ کچھ دنوں بعد انہیں ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے احکام مل گئے۔ والد صاحب نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور کسی طرح میرے شوہر کو اس بات پر رضا مند کر لیا کہ مجھے لے کر فرانس چلے جائے جہاں میری چھوٹی بہن فرزانہ اپنی تعلیم کا آخری سال مکمل کر رہی تھی۔ والد صاحب نے یہ سوچ کر ایسا کیا تھا کہ شاید اس طرح ہم دونوں کے درمیان جو خلیج حائل ہوتی جا رہی تھی وہ ختم ہو جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ فرانس پہنچ کر میرے شوہر میری بہن فرزانہ میں جو ہو بہو میری جیسی تھی لیکن زیادہ ماڈرن تھی دلچسپی لینے لگے۔ انہوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ فرزانہ سے یہ بھی کہہ دیا کہ میں آج تک بنی اسوان سے محبت کرتی ہوں۔ میرے اوپر طرح طرح کے الزام تراشے گئے۔ میری خاموشی کو ہزاروں معنی پہنائے گئے لیکن میں نے اف تک نہ کی اور حتی الامکان شوہر کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔"

یہاں پہنچ کر ریحانہ اپنے آنسو ضبط نہ کر سکی۔ میں خاموش بیٹھا اس کی کہانی بڑی حیرت سے سن رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ریحانہ اپنے آنسوؤں کو خشک کرتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"آج سے کوئی پندرہ روز پیشتر مجھے والد صاحب کا خط ملا کہ وہ سخت بیمار ہیں۔ میں نے اپنے شوہر سے واپسی کی درخواست کی تو وہ برہم ہو گئے۔ میں دل پر جبر کر کے خاموش ہو گئی۔ کچھ دنوں بعد گھر سے دوسرا تار آیا جس میں لکھا تھا کہ اگر آخری دیدار کرنا ہو تو فوراً" آ جاؤ۔ میرے شوہر اس بار واپسی کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن روانگی سے قبل انہوں نے بنی اسوان کی آڑ لے کر مجھے دل بھر کر برا بھلا کہا اور یہ بھی کہا کہ اب کی بار وہ وطن پہنچتے ہی اسے تلاش کر کے گولی مار دیں گے۔ اس کے بعد راستے میں جو کچھ واقعات پیش آئے وہ آپ کے سامنے ہیں۔"

"کیا آپ کے شوہر نے بنی اسوان کو جہاز پر دیکھ لیا تھا۔" میں نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"وثوق کے ساتھ میں کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے اسے آج پہلی بار دیکھا ہے۔ اس سے پہلے وہ مجھے جہاز پر نظر نہیں آیا تھا۔"

"پھر تو یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ فرزانہ اور آپ کے شوہر دونوں کی موت میں یقینی طور پر اسی کا ہاتھ ہو گا۔" میں نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے بنی اسوان نے جذبات سے مغلوب ہو کر یہ انتقامی کاروائی کی ہو۔"

ریحانہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نظریں جھکائے خاموش بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔ اس خیال سے کہ کہیں میرے اصرار پر اسے صدمہ نہ پہنچے میں کچھ دیر بیٹھا ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر اجازت لے کر اپنے کیبن میں آ گیا چلتے وقت میں نے ریحانہ سے کہا تھا کہ اگر اسے رات میں کسی وقت بھی میری کوئی ضرورت محسوس ہو تو بلا تکلف مجھے جگا لے۔ اس رات میں بڑی دیر تک اپنے بستر پر لیٹا اس حیرت انگیز داستان کے بارے میں سوچتا رہا جو مجھے ریحانہ نے سنائی تھی۔

○

میرے سفر کو ختم ہونے میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا۔ اس شام میری طبیعت

کچھ زیادہ ہی مضمحل اور بوجھل بوجھل سی تھی۔ میں جہاز کے اسنیک بار میں بیٹھا کافی سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ جہاز کا فرسٹ آفیسر جس سے میرے تعلقات اچھے خاصے استوار ہو چکے تھے میرے قریب آیا اور مجھے تنہا دیکھ کر معنی خیز نظروں سے بولا۔

"مسٹر طارق ------- آج آپ صبح سے کچھ اداس اداس نظر آ رہے ہیں۔"

"ہاں۔" میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "طبیعت پر کچھ گرانی محسوس ہو رہی ہے۔"

"میں کچھ اور سمجھا تھا" فرسٹ آفیسر نے جس کا نام جوزف مارٹن تھا۔ مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"کیا؟"

"میرا خیال تھا کہ شاید آپ کو ایک حسین ہم سفر کے چھوٹنے کا ملال ہو رہا ہے۔" مارٹن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا پھر قریب سے گزرتے ہوئے بیرے کو بلایا اور اپنے لئے کافی لانے کو کہا۔

"تمہارا اشارہ غالباً" میجر رحمان کی بیوہ کی طرف ہے۔" میں نے سرد آہ بھر کر جواب دیا۔ "لیکن میرے دوست تم جو کچھ سمجھ رہے ہو وہ غلط ہے۔ مجھے مسز رحمان سے صرف ہمدردی ہے۔ قدرت نے اسے جن حالات سے دوچار کر دیا ہے۔ وہ انتہائی پر اسرار اور نا قابل فہم ہے۔ میری جگہ اگر تم ہوتے تو شاید تم بھی ان واقعات سے متاثر ہوتے۔"

"مس فرزانہ کا قتل اور میجر کی موت سچ مچ ایسے حادثات ہیں جو مسز رحمان کے لئے صدمے کا سبب بن سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود میں نے یہی محسوس کیا ہے کہ وہ تمہارے اندر دلچسپی لے رہی ہے۔" مارٹن نے سگریٹ جلا کر اس کا دھواں اڑاتے ہوئے بڑی لاپرواہی سے کہا۔

مجھے مارٹن کا جواب بہت ناگوار گزرا ------- لیکن میں نے اس کا کچھ زیادہ اثر نہ لیا۔ اس لئے کہ مجھے اس بات کا بخوبی علم تھا کہ مارٹن جس قوم کا فرد ہے وہاں جذباتی لگاؤ کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی چنانچہ میں نے اس کی بات سن کر کوئی جواب نہ

دیا اور کافی کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ مارٹن نے غالباً" میری اس بے اعتنائی کو محسوس کر لیا تھا۔

"مسٹر طارق ------- اگر آپ کو میری بات ناگوار گزری ہے تو میں اس کے لئے معافی کا خواستگار ہوں" وہ قدرے سنجیدگی سے بولا "جہاز کا ایک ذمہ دار افسر ہونے کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ میں ہر مسافر کے آرام کا خیال رکھوں نہ کہ اسے تکلیف پہنچاؤں۔"

"ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے مسٹر مارٹن۔" میں نے ازراہ مذاق کافی کا تلخ گھونٹ حلق کے نیچے اتارتے ہوئے کہا۔ "میری خاموشی کی وجہ محض طبیعت پر چھایا ہوا اضمحلال ہے۔"

پھر اس خیال سے کہ کہیں مارٹن دوبارہ ریحانہ کا تذکرہ نہ شروع کر دے میں نے گفتگو کا رخ بدل دیا اور سفر کے بارے میں ادھر ادھر کی معلومات حاصل کرتا رہا مارٹن بڑی دیر تک بیٹھا مجھے اپنی بحری زندگی کے تجربوں اور ان واقعات کے بارے میں بتاتا رہا جو اس دوران سفر اکثر پیش آتے رہتے تھے۔ ایک گھنٹے تک وہ میرے سامنے بیٹھا بے تکان بولتا رہا پھر جب اس نے مجھ سے جانے کی اجازت مانگی تو معاً" میرے ذہن میں یہ خیال تیزی سے ابھرا کہ کیوں نہ میں مارٹن سے بنی اسوان کے بارے میں دریافت کر لوں۔ اس نام کا کوئی آدمی اگر جہاز پر سفر کر رہا ہے تو مارٹن یقیناً" اس سے واقف ہو گا۔ حالانکہ میں فرزانہ کے پر اسرار قتل کے بعد مسافروں کی فہرست کو دیکھ چکا تھا۔ لیکن اس خیال سے کہ ممکن ہے جلدی میں مجھے اس کا نام نظر نہ آیا ہو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ بنی اسوان کے سلسلے میں مارٹن سے پوچھ لوں۔ اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر مارٹن کی طرف بڑھایا اور دبی زبان میں گویا ہوا۔

"مسٹر مارٹن ------- میں تم سے جہاز کے مسافروں کے سلسلے میں کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔"

"جو چاہے پوچھو -------" اس نے نیا سگریٹ جلاتے ہوئے کہا پھر میز پر کہنیاں ٹکا کر میرے اوپر جھکتا ہوا سرگوشی میں بولا "کہیں تم مجھ سے مونیکا کے بارے

میں تو کچھ نہیں پوچھنا چاہتے ------- اگر ایسا ہے تو پھر سمجھ لو کہ تمہارا پہلا رقیب میں ہوں۔"

مونیکا اس لڑکی کا نام تھا جو خاصی فلرٹ تھی اور فرسٹ کلاس میں ہمارے ساتھ ہی سفر کر رہی تھی میں نے جہاز کے مسافروں کے علاوہ عملے کے بیشتر افسران کو بھی اس میں دلچسپی لیتے دیکھا تھا۔ مارٹن نے اس وقت مونیکا کا نام لیا تو میں بے اختیار ہنس پڑا پھر سنجیدگی سے بولا۔

"مطمئن رہو۔ میں مونیکا کے بارے میں تمہارا رقیب نہیں بنوں گا۔"

"شکریہ ------- اب تم جو چاہو پوچھ سکتے ہو۔"

"میں ایک شخص بنی اسوان کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا ہوں جو میری معلومات کے مطابق غالباً" اسی جہاز پر سفر کر رہا ہے۔" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"تمہیں اس کی اطلاع کہاں سے ملی ہے۔"

مارٹن یکلخت سنجیدہ ہو گیا پھر اس نے جس انداز میں گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھا اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اب ہمارے درمیان جو گفتگو شروع ہوئی ہے وہ اس کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

میں نے مارٹن کو بنی اسوان کے نام پر سنجیدہ ہوتے دیکھا تو میرا تجسس اور بڑھ گیا۔ چنانچہ میں نے جلدی سے کہا۔

"بنی اسوان کے بارے میں محض میرا قیاس ہے کہ وہ اس جہاز پر موجود ہے۔ کسی اور نے مجھے کوئی معلومات نہیں فراہم کی تھیں۔ لیکن تم یہ نام سن کر اس قدر سنجیدہ کیوں ہو گئے۔"

"تمہارے قیاس کی کوئی وجہ بھی ضرور ہو گی" اس نے مجھے گھورتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔ نہ جانے کیوں وہ اس وقت بڑے رازدارانہ لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔

"ہاں ------- آں -------" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا پھر مارٹن سے اس بات کا وعدہ لینے کے بعد کہ جو کچھ میں اس سے کہوں گا وہ اس کا تذکرہ کسی اور سے نہ کرے گا میں نے اسے وہ تمام داستان سنا ڈالی جو مجھے ریحانہ نے سنائی تھی۔

مارٹن کے چہرے پر پھیلی ہوئی سنجیدگی کچھ اور گہری ہو گئی۔ وہ مجھے الجھن بھری نگاہوں سے گھورے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جو تاثرات مجھے اس وقت نظر آئے تھے ان سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ شاید وہ میری بات کو مذاق سمجھ رہا ہے۔

"مسٹر مارٹن ------- خدا گواہ ہے کہ میں نے تمہیں جو کچھ بتایا ہے وہ مجھے ریحانہ سے معلوم ہوا تھا۔ تمہیں اگر میری باتوں پر یقین نہیں آتا تو میرے ساتھ آؤ ------- میں ریحانہ سے اس کی تصدیق کرا دوں گا۔"

"ہو سکتا ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو' لیکن۔"

مارٹن کچھ کہتے کہتے رک کر سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگانے لگا تو میری الجھن اور بڑھ گئی۔ وہ کسی ذہنی خلفشار میں مبتلا تھا۔ اس کی آنکھوں سے حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"تم کچھ کہتے کہتے رک گئے تھے۔" میں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں -------" اس نے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے جواب دیا۔ "تم نے مجھے مسز رحمان کی جو کہانی سنائی ہے وہ میرے لئے بے حد حیرت انگیز ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس داستان کو کیا سمجھوں۔"

"بنی اسوان کے بارے میں تم نے کچھ نہیں بتایا" میں مارٹن کی الجھن کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

"وہ اسی جہاز پر موجود ہے مسٹر طارق۔ لیکن میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بنی اسوان کسی کے قتل کا مرتکب نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔"

"کیا تم اس سے واقف ہو۔" میں نے کرسی پر پہلو بدلا۔

"نہیں ------- میں اسے براہ راست نہیں جانتا نہ ہی مجھے اس کے کردار کے بارے میں کچھ پتا ہے لیکن اس کے باوجود اس پر قتل کا الزام عائد نہیں ہو سکتا۔"

"تعجب ہے۔" میں نے حیرت سے کہا۔ "جب تم اس کے ماضی سے واقف ہی نہیں ہو تو اتنے یقین کے ساتھ اس کی بے گناہی کا دعویٰ کیوں کر رہے ہو۔"

"اس لئے کہ بنی اسوان ایک لاش کی صورت میں جہاز پر سفر کر رہا ہے۔"

"لاش کی صورت میں" میں اس انکشاف پر اچھل پڑا اور مارٹن کو وضاحت طلب نظروں سے گھورنے لگا۔ پھر اپنے حواس پر قابو پا کر پوچھا "کیا تم مجھے تفصیل بتا سکتے ہو مسٹر مارٹن کہ بنی اسوان کب اور کن حالات میں مرا تھا۔"

"مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے" مارٹن نے میرے پیکٹ سے ایک اور سگریٹ نکال کر سلگایا پھر طویل کش لے کر بولا۔ "ہمیں بنی اسوان کی لاش مصر کی بندرگاہ سے ایک تابوت نما لمبے صندوق میں ملی تھی ——— جہاز کے کپتان نے لاش کو ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا تھا لیکن بعد میں جب اسے بری بھاری رقم پیش کی گئی تو وہ اسے ساتھ لے جانے پر آمادہ ہو گیا۔ یہ راز کپتان اور میرے سوا کسی تیسرے آدمی کو معلوم نہیں ——— اگر تم نے مجھے مسز رحمان کی کہانی نہ سنائی ہوتی تو اس لاش کے بارے میں، میں تم کو بھی کچھ نہ بتاتا جو اس وقت بھی جہاز کے بیگیج روم میں ایک لانبے صندوق میں بند ہے۔ کپتان کی ہدایت پر اس صندوق پر وزنی مشینری کے حروف لکھوا دیئے گئے ہیں تاکہ کسی کو اس پر شبہ نہ ہو سکے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ اسے قتل کا مرتکب کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے۔"

میں پھٹی پھٹی نظروں سے مارٹن کے چہرے کو گھور رہا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں کسی نامعلوم خوف کے تحت ہر لمحے بڑھتی جا رہی تھیں۔ مارٹن خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

"کیا تمہیں علم ہے کہ وہ صندوق کپتان کے حوالے کس نے کیا تھا۔"

"ممکن ہے کہ اس شخص نے غلط بیانی سے کام لیا ہو لیکن اس کا بیان یہی تھا کہ وہ بنی اسوان کا باپ ہے اور مصر میں تجارت کرتا ہے۔"

"تمہیں بنی اسوان کا نام کیسے معلوم ہوا تھا؟"

"کپتان نے احتیاطاً" لاش کے سلسلے میں اپنا اطمینان کرنے کے لئے اس کی موت کا سرٹیفکیٹ طلب کر لیا تھا۔ سرٹیفکیٹ میں بنی اسوان کی موت کو طبعی قرار دیا گیا ہے" مارٹن نے مجھے تفصیل بتاتے ہوئے کہا "کپتان کو صرف اتنا کرنا ہے کہ اس صندوق کو اگلی بندرگاہ پر اتار کر کسی آدمی کے ذریعے اس پتے پر پہنچا دے جو اسے دیا گیا ہے۔"

"کیا تمہیں وہ پتا یاد ہے۔" میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔ اگلی بندرگاہ نہ صرف یہ کہ میری ہی منزل تھی بلکہ ریحانہ کو بھی یہیں اترنا تھا۔

"مجھے زبانی یاد نہیں ہے لیکن تم اگر چاہو تو میں کاغذات دیکھ کر بتا سکتا ہوں۔"

"اگر تم یہ کام کر سکو تو میں یقیناً" تمہارا شکر گزار ہوں گا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

مارٹن تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد مجھے ساتھ لئے اپنے کیبن میں آیا پھر اس نے کیبن کے دروازے کو اندر سے بند کیا اور اپنی آہنی الماری سے ایک فائل نکال کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا پھر اس نے مجھے جو پتا بتایا وہ ریحانہ کے مکان کا تھا۔ میں حیرت بھری نظروں سے اس پتے کو دیکھ رہا تھا جسے مارٹن نے اپنی یادداشت کے طور پر فائل پر پنسل سے لکھ رکھا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر بنی اسوان کی لاش کو ریحانہ کے پتے پر روانہ کرنے سے بھیجنے والے کا کیا مقصد حل ہو سکتا تھا۔ دوسری بات جو مجھے پریشان کر رہی تھی وہ ریحانہ کا بیان تھا۔ اس نے مجھے یہی بتایا تھا کہ بنی اسوان کو وہ اپنے کیبن میں دیکھ چکی ہے۔ خود میں نے بھی اسے خواب کی کیفیت میں دیکھا تھا۔

کچھ دیر تک میں واقعات کی کڑیوں کو ملاتا رہا اور ان اسرار کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا پھر اچانک میں نے مارٹن کو مخاطب کر کے کہا۔

"مسٹر مارٹن۔ کیا بنی اسوان کے ساتھ کوئی اور چیز کپتان کو نہیں دی گئی تھی۔"

"ایک بند لفافہ بھی تھا۔ لیکن وہ کپتان کی تحویل میں ہے مگر تم ...."

"میرے دوست میری ایک درخواست ہے" میں نے مارٹن کے جملے کو کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا "کیا تم ایک نظر بنی اسوان کی لاش مجھے دکھا سکتے ہو ———؟"

"مشکل کام ہے۔ اگر مسافروں کو حالات کا علم ہو گیا تو افراتفری پھیل جائے گی۔" مارٹن نے سنجیدگی سے کہا پھر چونکتے ہوئے بولا۔ "کیا تمہارا خیال ہے کہ مسز رحمان کے ساتھ جو کچھ پیش آیا ہے اس کی ذمہ داری اسی لاش پر عائد ہوتی ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ صندوق کو اندر سے ایک نظر دیکھ لینے کے بعد ہمیں کوئی اہم بات معلوم ہو جائے۔"

مارٹن نے فوراً" ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ چند ثانئے تک وہ میرے چہرے کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے قدرے جھجکتے ہوئے اس بات کی حامی بھرلی کہ مجھے بنی اسوان کی لاش دکھا دے گا۔

میں مارٹن کے ساتھ بیٹھا اسی مسئلے پر بڑی دیر تک تبادلہ خیالات کرتا رہا۔ جب شام کو جھٹپٹا رات کی تاریکی میں گم ہوگیا تو مارٹن مجھے اپنے ساتھ لے کر بیگج روم میں آگیا جہاں دیگر سازو سامان کے علاوہ ایک لمبی پیٹی بھی الگ تھلگ رکھی ہوئی تھی۔ اس پر بھاری بھرکم مشینری کے الفاظ درج تھے۔

میرا دل کسی آنے والے خطرے کے پیش نظر دھڑک رہا تھا۔ مارٹن نے بڑی آہستگی سے بیگج روم کا دروازہ اندر سے بند کیا پھر بڑے صندوق کو کھولنے لگا۔ حتی الامکان وہ یہی کوشش کر رہا تھا کہ زیادہ آوازہ نہ ہونے پائے۔ تقریباً" بیس منٹ تک وہ اپنے کام میں منہمک رہا۔ اس عرصے میں' میں دروازے سے کان لگائے کھڑا باہر کی سن گن لیتا رہا تھا مگر میری نظریں بدستور مارٹن کے چہرے پر مرکوز تھیں جو اب صندوق کے ڈھکنے کو آہستہ آہستہ کھول رہا تھا اور پھر ——— صندوق کھولتے ہی مارٹن کے چہرے پر خوف و وحشت کے اثرات پھیل گئے۔ وہ تیزی سے صندوق کے پاس سے پیچھے ہٹا تھا۔

مارٹن کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر میرے دل کی دھڑکنیں اور تیز ہوگئیں۔ میں لمبے لمبے قدم اٹھاتا تیزی سے اس کے قریب گیا پھر جیسے ہی میں نے صندوق میں نظرڈالی حیرت کے مارے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ صندوق اندر سے بالکل خالی تھا اس میں سے صندل اور کافور کی تیز خوشبو پھوٹ رہی تھی بالکل ویسی ہی جیسی تابوت میں سے آتی ہے۔

میں اور مارٹن دونوں ہکا بکا کھڑے ایک دوسرے کو وضاحب طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ معاً" میرے ذہن کے کسی گوشے میں دستک کی آواز گونج اٹھی۔ بالکل ویسی ہی جیسی میں کئی بار اپنے کیبن کے دروازے پر سن چکا تھا ——— اچانک میرے دل میں ایک خیال بڑی سرعت سے ابھرا ——— دوسرے ہی لمحے میں بھاگتا ہوا دروازے تک آیا اور اسے کھول کر پھر دوڑنے لگا۔ میرا رخ ریحانہ کے

کیبن کی طرف تھا۔ میری چھٹی حس کسی آنے والے خطرے کا اعلان کر رہی تھی۔

ریحانہ کے کیبن کے سامنے پہنچ کر میں ایک لمحے کے لئے رکا پھر دھڑکتے ہوئے دل سے میں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے وہاں جو کچھ دیکھا وہ میرے اعصاب کو جھنجھوڑ ڈالنے کے لئے کافی تھا۔ ریحانہ کی سرد لاش کیبن کے عین درمیان چھت سے بندھی جھول رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف اور وحشت کے تاثرات اب تک موجود تھے۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابل پڑی تھیں۔ انجم اور پرویز کیبن کے فرش پر پڑے تھے۔ قاتل نے ان دونوں معصوم بچوں کی مشکیں اس قدر سختی سے باندھی تھیں کہ ان کے جسموں پر جگہ جگہ نیل پڑ گئے تھے۔ دونوں کے جسم اکڑ چکے تھے لیکن ان کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اس وقت بھی چھت سے لٹکی ہوئی اپنی ماں کی لاش کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس منظر کو دیکھ کر میں سرتاپا لرز اٹھا اور جلدی سے خود کو سنبھالتا باہر آگیا جہاں مارٹن کھڑا مجھے آوازیں دے رہا تھا میرے چہرے پر نظرپڑتے ہی وہ جلدی سے میرے قریب آیا اور گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کیا بات ہے میرے دوست .... تم بیگج روم سے دیوانوں کی طرح کس لئے بھاگے تھے اور یہ تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں۔"

"کسی نے ریحانہ اور اس کے بچوں کو بھی قتل کر دیا ہے۔" میں نے اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

مارٹن نے میری اطلاع پر کیبن کے اندر جا کر اپنی آنکھوں سے اس خوفناک منظر کو دیکھا پھر باہر آکر بوکھلائی ہوئی آواز میں بولا۔

"مسٹر طارق .... ہمیں اس حادثے کی اطلاع فوراً" کپتان کو دینی چاہئے۔ لیکن اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم اس صندوق کو دوبارہ بند کر دیں قبل اس کے کہ کپتان مجھ سے باز پرس کرے۔"

میں لرزتے کانپتے قدموں سے مارٹن کے ساتھ بیگج روم میں آیا جہاں لمبا صندوق اب تک کھلا پڑا تھا۔ لیکن ہم دونوں جب اس کے قریب گئے تو ہمارے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ آنکھیں مارے حیرت کے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ہم پھٹی

پھٹی نظروں سے اس لاش کو دیکھ رہے تھے جو صندوق کے اندر کفن میں لپٹی لپٹائی بے حس و حرکت موجود تھی۔ مارٹن نے بڑی ہمت کر کے لاش کے سر کے قریب سے کفن تھوڑا سا ہٹا کر مردہ چہرے پر نظر ڈالی پھر اس بات کی تصدیق کی کہ وہ لاش بنی اسوان ہی کی تھی' جسے مصر کی بندرگاہ سے جہاز کے کپتان کے حوالے کیا گیا تھا اور کپتان نے مارٹن کی موجودگی میں صندوق کو کھلوا کر لاش دیکھی تھی اسے شبہ تھا کہ کہیں لاش کے بہانے کوئی نا جائز چیز اس کے حوالے نہ کی جا رہی ہو۔

اس خیال سے کہ کہیں ریحانہ اور اس کے بچوں کی پر اسرار موت کی اطلاع پا کر مسافروں میں خوف و ہراس نہ پھیلے جہاز کے کپتان نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس حادثے کو صرف اپنے ہی تک محدود رکھوں۔ ریحانہ اور اس کے بچوں کی لاش کو آدھی رات گئے چپ چپاتے چرمی تھیلوں میں بند کر کے سمندر کی بیقرار موجوں کے حوالے کر دیا گیا۔ اسی رات میرے اصرار پر کپتان نے مجھے وہ لفافہ بھی دکھایا جو اسے بنی اسوان کے تابوت کے ساتھ ہی منزل مقصود تک پہنچانا تھا۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تہہ کئے ہوئے کاغذ کو کھولا اور دھڑکتے ہوئے دل سے اس تحریر کو پڑھنے لگا جو بنی اسوان کے باپ نے ریحانہ کے والد کے نام لکھی تھی۔

میرے محترم دوست۔

میں وہ بدنصیب باپ ہوں جو اپنے اکلوتے لڑکے کی لاش کو بھی خود سے جدا کر رہا ہوں۔ میں بنی کی وصیت کے مطابق تمہارے پاس اس غرض سے اس کی لاش بھیج رہا ہوں کہ تم اس کی تجہیزو تکفین کا بندوبست کرو۔ اس خط کے ساتھ ہی میں بنی اسوان کی تمام جائداد منقولہ و غیر منقولہ کے کاغذات بھی تمہیں روانہ کر رہا ہوں۔ میرے بد نصیب بچے کی خواہش تھی کہ یہ تمام جائیداد اس کے مرنے کے بعد تمہاری بیٹی ریحانہ کے نام کر دی جائے۔

ویسے بنی اسوان اسی دن مر گیا تھا جب تم نے ریحانہ کے ساتھ اس کے رشتے کو مسترد کر دیا تھا۔ بنی کے سلسلے میں تمہارا سلوک کس قدر ناروا اور ظالمانہ رہا ہے۔ شاید تم اس کا اندازہ نہ کر سکو۔ ریحانہ سے ملنے کے بعد وہ صرف ریحانہ کے بارے سوچتا تھا لیکن جب تم نے اسے دھتکار دیا اور اس کے بے پناہ عشق کا مذاق اڑایا تو

اس کی حالت قابل رحم ہو گئی۔ وہ دیوانوں کی طرح دیواروں سے سر پھوڑتا تھا۔ پھر جب ریحانہ کی شادی کی اطلاع ملی تو وہ بالکل ٹوٹ گیا۔ وہ پاگلوں کی مانند مارا مارا پھرتا اور مہینوں گھر سے غائب رہتا۔ اسے گھر سے کوئی رغبت تھی نہ لباس سے' نہ کھانے پینے سے اور نہ مجھ سے۔ آخری بار جب وہ کئی ماہ غائب رہنے کے بعد واپس آیا تو دو چار روز تک وہ اپنے کمرے میں بند رہا۔ پھر اس نے اپنی وحشتوں سے تنگ آ کر خودکشی کر لی۔ مجھے اس کی لاش پر سے جو خط ملا اس میں میرے حرماں نصیب بچے نے اسی خواہش کا ذکر کیا تھا کہ میں اس کی لاش کو آخری رسوم کے لئے تمہارے رحم و کرم پر چھوڑ دوں۔

مجھے اپنے بچے کی اس آخری وصیت کو پورا کرنے کے لئے اس کی موت کو اپنے عزیز و اقارب سے بھی چھپانا پڑا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کی بے گور و کفن لاش کو بھی گیارہ روز تک اپنے سینے سے لگائے رکھنا پڑا اس لئے کہ اس نے اپنے خط میں جس خاص جہاز سے تابوت کی روانگی کی التجا کی تھی اس کی آمد میں گیارہ دن باقی تھے۔ چنانچہ مجھے مسالوں کے ذریعے لاش کو محفوظ کرنا پڑا۔

بہر حال اب میں اپنے جگر گوشے کو تمہارے سپرد کر رہا ہوں اور ہاتھ جوڑ کر درخواست کرتا ہوں کہ اس کی لاش کے ساتھ تم کوئی ناروا سلوک نہ کرنا ورنہ اس کی روح کو کبھی سکون نہ ملے گا۔ میرے بد نصیب بچے نے اپنے خط میں اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا کہ کاش وہ ریحانہ کے پہلو بہ پہلو دفن ہو سکتا۔ یہ جملہ اس نے کیوں کہا تھا میں نہیں سمجھ سکا لیکن شاید اسے یہ امید رہی ہو گی کہ اگر وہ زندگی میں اپنی محبت میں ناکام رہا ہے تو ممکن ہے دوسری دنیا میں وہ ریحانہ کو حاصل کر لے۔ کاش تم میرے بچے کی لازوال محبت کی قدر کر سکتے۔ اے کاش ......!

بنی کا حرماں نصیب باپ



اس واقعے کو آج پندرہ برس بیت چکے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ریحانہ کے باپ نے بنی اسوان کے تابوت اور اس کی جائیداد کے کاغذات کا کیا کیا۔ نہ ہی مجھے اس

بات کا کوئی علم ہے کہ جہازراں کمپنی نے ریحانہ' اس کے شوہر' بچوں اور بہن کی پر اسرار اموات کے سلسلے میں ریحانہ کے والد کو کیا اسباب بتائے ہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس اندوہناک حادثے نے میرے ذہن پر اتنا گہرا اثر چھوڑا ہے کہ ——— آج بھی اس واقعے کو یاد کر کے میرے بدن کے رونگٹے مارے دہشت کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

آج بھی جب کوئی میرے دروازے پر دستک دیتا ہے تو میں خوف سے کانپ جاتا ہوں اور گزرے ہوئے واقعات کی ایک ایک یاد میرے ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے۔



رادھیکا

پہلے میں اپنے بارے میں کچھ بتاتا چلوں۔ 1931ء میں جب میرے والد کا انتقال ہوا تو مردان شاہ کے سوا میرا اور کوئی دوست نہ تھا۔ مردان شاہ کے بارے میں مجھے صرف اس قدر معلوم ہے کہ اسے میرے والد نے جو ان دنوں ہتھورو کے اسٹیشن پر تعینات تھے۔ چھ ماہ کی عمر سے گود لے کر پالا تھا۔ اس کے والد کون تھے۔ کہاں تھے۔ میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ مجھے کچھ جاننے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اس لئے کہ میں اسے اپنا بڑا بھائی سمجھتا تھا اور وہ مجھے اپنا چھوٹا بھائی۔ وہ نیک طینت' محنتی اور ایماندار شخص تھا ——— والدہ تو پہلے ہی اللہ میاں کو پیاری ہو چکی تھیں۔ جب والد صاحب بھی چلے گئے تو ہم دونوں کا خدا کے سوا اور کوئی سہارا نہ رہا۔ مردان شاہ نے سخت محنت مزدوری کی اور ہم نے بڑی بے بسی اور بے کسی سے زندگی کی گاڑی کھینچنا شروع کر دی۔ مردان شاہ میرے اور میں مردان شان کے کام آتا۔

ہتھورو میں میرا آبائی مکان صرف دو کمروں پر مشتمل تھا جس کے آگے ایک چھوٹا سا سائبان تھا۔ البتہ صحن خاصا کشادہ تھا۔ مردان شاہ نے میرے والدین کی زندگی میں صحن کے ایک حصے میں اپنے لئے ایک جھونپڑی ڈال رکھی تھی لیکن میرے والد کی موت کے بعد وہ میرے ساتھ اندرونی حصے میں رہنے لگا تھا۔

میرے والد بلازم پیشہ تھے اور عسرت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ اس لئے ان کے مرنے کے بعد مجھے روزگار کی تلاش کرنی پڑی۔ میں نے اس وقت صرف میٹرک کیا تھا۔ دو چار جگہ ملازمت کی کوشش کی لیکن ہندو مہاجنوں اور ساہوکاروں نے میری بدحالی کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ میں نے سوچا کیوں نہ ہتھورو چھوڑ کر میرپور خاص چلا جاؤں اور وہاں جا کر قسمت آزماؤں لیکن مردان شاہ نے مجھ سے اتفاق نہ کیا' اور

"رو ہی میں ملازمت حاصل کرنے کی رائے دی۔ میں نے اپنی جدوجہد دوبارہ شروع کر دی لیکن نتیجہ مایوسی کے سوا کچھ نہ نکلا۔ مردان شاہ نے اس عرصے میں ایک مقامی مہاجن امرناتھ کے ہاں بیس روپے کی ملازمت کر لی تھی جس میں بڑی تنگی ترشی کے ساتھ ہمارا گزارا ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک روز میں نے شرم کو بالائے طاق رکھ کر پتھورو کے اسٹیشن ماسٹر سے ملاقات کی اور بڑے عجز سے کہا کہ اگر وہ مجھے اپنے محکمے میں کوئی ملازمت دلا دے تو میں تمام عمر اس کا احسان مند رہوں گا۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ اسٹیشن ماسٹر کے تعلقات میرے والد کے ساتھ اچھے نہ تھے۔ اس لئے ملازمت مل جانے کی مجھے زیادہ توقع نہ تھی لیکن میری توقعات کے خلاف اسٹیشن ماسٹر نے وعدہ کر لیا کہ وہ کوشش کرے گا اور پندرہ سولہ روز بعد ہی اس نے مجھے اپنے پاس پینتالیس روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔ مجھے اس وقت ملازمت ملنے کی بے پناہ خوشی ہوئی۔ گھر جا کر میں نے مردان شاہ کو بتایا تو وہ بھی خوشی سے ناچنے لگا۔ اس رات مجھے والد کی موت کے بعد پہلی بار پر سکون نیند آئی تھی لیکن میں نے سونے سے قبل مردان شاہ کو تاکید کر دی تھی کہ مجھے صبح چھ بجے ضرور اٹھا دے تاکہ میں وقت پر اپنی نئی ملازمت پر پہنچ سکوں۔ مردان شاہ نے مسکرا کر وعدہ کر لیا اور میں بے خبر ہو کر سو گیا۔

ڈھائی ماہ تک میں پتھورو کے اسٹیشن پر رہا۔ اس عرصے میں مجھے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی اسٹیشن ماسٹر کا رویۂ میرے ساتھ بہت اچھا تھا لیکن ڈھائی ماہ بعد جب ایک روز اس نے مجھے اپنے چھوٹے سے دفتر میں بلا کر کہا کہ تمہیں پندرہ بیس روز کے لئے کنری بھیجا جا رہا ہے تو نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے وہ مجھے پتھورو سے دور ہٹانا چاہتا ہے۔"

حالانکہ کنری کا اسٹیشن پتھورو سے ایک دو اسٹیشن بعد ہی تھا لیکن میں کنری جانے کے لئے تیار نہ تھا۔ اول تو اس لئے کہ مردان شاہ سے ایک لمحے کے لئے بھی جدائی مجھے گوارا نہ تھی۔ دوسرے یہ کہ کنری تھرپارکر کے علاقے میں اس زمانے میں ہندوؤں کا گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ وہاں سیٹھ ساہوکار سے لے کر ٹھگ چور اور اسمگلر تک ہر قسم کے ہندو موجود تھے۔ چنانچہ اسٹیشن ماسٹر کے حکم پر میں نے سر جھکا کر کہا۔

"میں کنری نہیں جانا چاہتا۔ آپ مجھے یہیں رہنے دیں تو بڑی مہربانی ہو گی۔"

"گھبراؤ نہیں۔ تم وہاں مستقل نہیں رہو گے صرف بیس روز کی بات ہے۔"

"لیکن جناب میں۔"

"بحث مت کرو۔" اسٹیشن ماسٹر بولا "میں نے کنری کے اسٹیشن ماسٹر کو زبان دی ہے۔ تمہارا جانا بہت ضروری ہے۔ بیس روز بعد میں تمہیں واپس بلا لوں گا۔"

میں منہ لٹکائے خاموشی سے گھر چلا آیا۔ شام کو جب میں نے مردان شاہ سے تذکرہ کیا تو اس نے بھی یہی کہا کہ اگر بات صرف بیس روز کی ہے تو میرے چلے جانے میں بظاہر کوئی حرج نہیں ہے۔ میں ملازمت کے سلسلے میں پہلے ہی خاصے تلخ تجربے حاصل کر چکا تھا۔ ان کے پیش نظر یہی بہتر تھا کہ میں اسٹیشن ماسٹر کی بات مان لوں۔ اگر بیس روز بعد واپسی نہ ہوئی تو پھر دیکھا جائے گا۔ غرضیکہ میں دوسرے ہی روز کنری کے لئے روانہ ہو گیا۔ جہاں میرے ساتھ ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔

کہنے کو تو کنری ایک مختصر سا گاؤں ہے لیکن جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے وہ خوب جانتے ہونگے کہ اس چھوٹے سے گاؤں میں کیسے کیسے خوبصورت مکانات اور حویلیاں موجود ہیں اور ان حویلیوں کے اندر دنیا جہان کی چیزیں افراط سے موجود رہتی ہیں۔ لیکن مجھے ان سب باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں نے چلتے وقت ہی طے کر لیا تھا کہ جتنے دن وہاں رہوں گا' صرف اپنے کام سے کام رکھوں گا۔

کنری کے اسٹیشن ماسٹر نے' جس کا نام پرشوتم تھا۔ مجھے اسٹیشن ہی پر رہنے کے لئے وہ کوٹھری دے دی جس میں پرانا آدمی رہا کرتا تھا اور ان دنوں بیس روز کی چھٹی پر اپنے والدین سے ملنے چھور گیا ہوا تھا۔

تین روز تک کوئی قابل ذکر بات نہ ہوئی۔ پرشوتم نے بھی مجھ سے کچھ نہیں کہا لیکن چوتھے روز جب میں کام سے فارغ ہو کر جانے لگا تو اس نے مجھے بلایا میں خاموشی سے اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور دل ہی دل میں یہ دعائیں مانگنے لگا کہ وہ اسی وقت مجھے پتھورو واپس جانے کا حکم سنا دے۔ پرشوتم کچھ دیر تک مجھے سر سے لے کر پاؤں تک گھورتا رہا پھر مسکرا کر بولا۔

"تم مجھے کام کے آدمی نظر آتے ہو۔ سوچتا ہوں کہ تمہیں یہاں مستقل کر لوں۔

کیا خیال ہے تمہارا۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ہوگی صاحب اگر مجھے چھورو واپس بھیج دیں۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"کیوں۔ کیا یہاں تمہیں کوئی تکلیف ہے۔"

"تکلیف تو نہیں ہے صاحب لیکن اپنے گھر پر مجھے زیادہ سکون ملتا ہے۔"

"ملا خان نے مجھے بتایا تھا کہ تم پڑھے لکھے بھی ہو؟" (ملا خان چھورو کے اسٹیشن ماسٹر کا نام تھا)۔

"جی ہاں صاحب۔ میں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی ہے۔"

"تم اگر چاہو تو میں تمہیں ایسا کام دلوا سکتا ہوں جس میں اچھی خاصی آمدنی ہو سکتی ہے۔" پرشوتم نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "ٹھاکر اربند کو ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو تمہاری طرح مضبوط اور بھولا بھالا ہو۔ جیون بھر سکھ کی بنسری بجاؤ گے، پنیتالیس پچاس کی ملازمت میں آخر کب تک زندگی بسر کرتے رہو گے؟"

ٹھاکر اربند کا نام سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ تھرپارکر کے علاقے کا بچہ بچہ اس کے نام سے واقف تھا۔ اس کے آدمی تیز رفتار گھوڑیوں پر بڑے دھڑے کے ساتھ ہندوستان کی سرحد سے ناجائز تجارت کرتے تھے لیکن اتنی مجال پولیس میں نہ تھی کہ اس پر ہاتھ ڈال سکے۔ اربند نے افسروں کے مہینے باندھ رکھے تھے۔ اس لئے ماتحت عملہ بھی اربند سے گھبراتا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ پرشوتم مجھے ٹھاکر کے پاس کس کام کے لئے رکھانا چاہتا ہے۔ دو دن ہوئے میں نے ٹھاکر کو پرشوتم کے ساتھ رازدارانہ گفتگو کرتے بھی دیکھا تھا۔ میں نے جب کوئی جواب نہ دیا تو پرشوتم نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"بت کی طرح کھڑا میری شکل کیا تکے جا رہے ہو، میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا۔"

"ریلوے کی ملازمت مجھے زیادہ اچھی لگتی ہے صاحب!" میں نے بات ٹالنے کی خاطر کہا تھا۔ "پنیتالیس روپے میری تنہا ذات کے لئے بہت کافی ہیں۔"

"کوئی جلدی نہیں ہے۔ پھر سوچ کر جواب دے دینا۔"

پرشوتم یہ کہہ کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور میں جلدی سے واپس باہر آ گیا۔ اس عرصے میں، میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں پرشوتم کی اس پیشکش کو کبھی قبول نہیں کروں گا۔ اگلے دو روز تک پرشوتم نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ مگر تیسرے روز جب میں رات کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنی کوٹھری میں لیٹا تھا تو پرشوتم کا ملازم مجھے بلانے آ گیا۔ میں نے سوچا کہ ملازم کے ساتھ جانے سے انکار کر دوں لیکن مجھے ہمت نہ ہوئی ——— بادل نخواستہ میں نے ملازم سے کہا کہ تم چلو میں آتا ہوں اس کے جانے کے بعد میں کچھ دیر الجھن میں مبتلا رہا۔ پھر اٹھ کر اجلے کپڑے پہنے اور پرشوتم کے گھر کی طرف چل دیا جو اسٹیشن سے دو فرلانگ دور تھا۔ میں تمام راستے سوچتا رہا۔ پھر خیال تھا کہ ممکن ہے پرشوتم نے مجھے اسی مقصد سے بلایا ہو جس کا ذکر وہ تین روز پہلے کر چکا تھا۔ میں اپنے خیالوں میں غرق تیزی سے قدم بڑھا رہا تھا کہ ایک ویرانے سے گزرتے ہوئے جہاں گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا، ایک نسوانی آواز نے میرا نام لے کر مجھے پکارا تو میں چونک کر رک گیا۔

وہ ایک شیریں اور دلنواز آواز تھی۔ میں نے اتنی رسیلی آواز پہلے کبھی نہیں سنی تھی اور نہ اس سے پہلے کبھی میری زندگی میں کسی عورت کا عمل دخل رہا تھا۔ میں نے بڑی سادہ اور پاکباز زندگی بسر کی تھی۔ حالانکہ میں اس وقت صحت و شباب کے دور سے گزر رہا تھا۔ اس گھپ تاریکی میں یہ آواز سن کر اور اپنا نام سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی ہے۔

"احمد دین ——— سنو۔"

دوسری بار جب میرا نام لے کر آواز دی گئی تو میں نڈر ہو کر اس طرف چلا گیا۔ کچے راستے سے ہٹ کر برگد کے درخت کے نیچے پہنچا تو میری حیرت دو چند ہو گئی۔ ایک انتہائی خوبصورت عورت جس کی عمر مشکل سے پچیس سال ہو گی۔ درخت کے نیچے موجود تھی۔ اس نے اپنا بدن ایک چادر میں لپیٹ رکھا تھا لیکن چہرہ کھلا ہوا تھا۔ ابھی میں حیرت سے اس کا خوبصورت چہرہ ہی دیکھ رہا تھا کہ اس نے بری مترنم آواز میں کہا۔

"تم شاید پرشوتم کے بلاوے پر اس کے گھر جا رہے ہو۔"

"جی ہاں۔ آپ کا خیال درست ہے لیکن آپ نے مجھے کیوں آواز دی ہے؟" میں نے اس کے خوبصورت چہرے کو حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم مجھے اپنا ہمدرد سمجھ لو۔" عورت جلدی سے بولی پھر دائیں بائیں دیکھ کر اس نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "احمد دین .... میں اس وقت یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتی۔ تم اگر چاہو تو کسی روز بھی رات کے بارہ بجے کے بعد نرنجن لال کی حویلی میں آکر مجھ سے بے دھڑک مل سکتے ہو۔ اس وقت میں تمہیں صرف اتنا بتانے آئی ہوں کہ تمہارا پرشوتم کے گھر جانا ٹھیک نہیں۔"

"کیوں ——— کیا وہاں میرے لئے کوئی خطرہ ہے۔" میں نے لاپروائی سے سوال کیا۔

"ہاں ——— اگر تم وہاں گئے تو تم بھی پھنس جاؤ گے پولیس کی ٹکڑی آج وہاں چھاپا مارنے والی ہے۔" عورت نے دوبارہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا پھر اس سے پیشتر کہ میں کچھ اور دریافت کرتا اس نے چادر میں اپنا حسین چہرہ چھپایا اور تیز تیز قدم اٹھاتی میری نظروں سے دور جا کر اندھیرے میں مدغم ہو گئی۔

عورت کے بارے میں اتنا اندازہ تو مجھے ہو گیا تھا کہ وہ ہندو ہے لیکن میں یہ نہ جان سکا کہ وہ کون تھی۔ مجھے کیسے جانتی تھی؟ اور یہ کہ اس نے مجھے خطرے سے محفوظ رکھنے کی کوشش کس وجہ سے کی تھی؟ عورت کے جانے کے بعد بھی میں بہت دیر تک وہیں کھڑا اپنے ذہن میں ابھرنے والے سوالات کا حل تلاش کرتا رہا۔ میرا دل یہی کہتا تھا کہ میں پرشوتم کے گھر جانے کے بجائے اپنی کوٹھری کی طرف لوٹ جاؤں لیکن یہ بھی ڈر تھا کہ اگر میں نہ گیا تو وہ صبح مجھ پر برہم ہو گا۔ یہ سوچ کر دوبارہ اس کے گھر کی سمت قدم بڑھانے لگا۔ جیسے جیسے فاصلہ کم ہوتا جاتا تھا۔ میری الجھن بڑھتی جاتی تھی۔

اس وقت رات کے کوئی نو بجے کا عمل ہو گا۔ ہر طرف گہری تاریکی مسلط تھی۔ کسی کسی مکان میں ابھی تک روشنی ہو رہی تھی۔ پرشوتم کا مکان اب صرف پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر تھا۔ میں اپنے خیال میں الجھا آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک دم ٹھٹک کر رک گیا۔ پولیس کی سیٹیوں کی آواز نے میرے قدم روک لئے۔ پھر آناً فاناً

پولیس کے جوانوں نے جو اندھیرے میں چھپے بیٹھے تھے ایک دم سامنے آکر پرشوتم کا مکان گھیرے میں لے لیا۔ راستے میں ملنے والی عورت نے مجھے جس خطرے سے ہوشیار کیا تھا۔ وہ سچ نکلا۔ میں کسی تامل کے بغیر تیزی سے پلٹا اور اسٹیشن کی طرف ہو لیا۔ میرا اس وقت بچ نکلنا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔

رات بھر میں ایک پل کے لئے بھی نہ سو سکا۔ کوٹھری بند کئے پڑا رہا اور اس عورت کے بارے میں سوچتا رہا جس نے بروقت مجھے پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کیا تھا۔ اگر وہ مجھ سے راستے میں نہ ملی ہوتی تو میرا پھنس جانا یقینی بات تھی۔ بہر حال رات بھر میں اسی عورت کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ کون تھی؟ مجھے کیسے جانتی تھی؟ اور اس نے رات کے بارہ بجے کے بعد ہی کیوں بلایا۔ اس ویرانے میں وہ حسین عورت کیا کر رہی تھی؟ میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی تھی۔ بہرحال میں نے طے کر لیا تھا کہ اس خوبصورت محسنہ سے مل کر کم از کم اس کا شکریہ ضرور ادا کروں گا۔

دوسرے روز صبح میں پلیٹ فارم پر گیا۔ پرشوتم روزانہ سات بجے آنے کا عادی تھا لیکن آٹھ بج چکے تھے اور وہ نہیں آیا تھا۔ پھر جب ساڑھے آٹھ بجے تو میں نے اسے دفتر میں موجود پایا۔ اس کے چہرے پر الجھن اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات نظر آ رہے تھے۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ رات بھر جاگتا رہا ہے۔ میں نے سوچا اسے بتا دوں کہ میں رات اس کے بلانے پر گیا تھا۔ لیکن حالات کے پیش نظر واپس چلا آیا۔ کئی بار میں نے ہمت کی لیکن پھر یہ سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا کہ جب وہ دریافت کرے گا تو بتا دوں گا۔ دوپہر کو مجھے ریلوے میں کام کرنے والے ایک دوسرے ملازم سے معلوم ہوا کہ رات پولیس پرشوتم کے ساتھ ٹھاکر اربند کو بھی پکڑ لے گئی تھی لیکن صبح انہیں ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ میرا خیال تھا پرشوتم مجھے ضرور اپنے کمرے میں بلا کر رات کو نہ آنے کی وجہ دریافت کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ دن بھر اپنے کمرے میں تنہا کام کرتا رہا۔ پھر خاموشی سے اٹھ کر گھر چلا گیا۔

پرشوتم اور ٹھاکر کی گرفتاری اور رہائی کی اطلاع پا کر مجھے وہی عورت پھر یاد آنے لگی۔ جس نے مجھے ایک بڑے خطرے سے بچا دیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ اسی وقت جا کر

اس کا شکریہ ادا کر آؤں لیکن پھر خیال آیا کہ اس نے کہا تھا کہ رات بارہ بجے کے بعد ملاقات ہو سکتی ہے۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد میں عادت کے مطابق آرام کرنے کی غرض سے لیٹ گیا۔ نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ میرے حواس پر صرف ایک چیز طاری تھی۔ اور وہ تھی اس عورت کی پر اسرار ذات۔ جس قدر میں اس کے بارے میں سوچتا۔ میرا اضطراب اتنا ہی بڑھ جاتا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اس سے برسوں سے واقف ہوں اور پھر ——— پھر مجھے اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ مجھے اپنے اس خیال پر ہنسی بھی آئی۔ میں نے یہ خیال دل سے نکالنا بھی چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ ایک عجیب سا احساس میرا دل گدگدا رہا تھا۔

رات کے بارہ بجے کے بعد بے چینی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے بدلے اور دبے قدموں کوٹھری سے باہر آگیا اور آبادی کی طرف ہو لیا۔ نرنجن لال کی حویلی کے بارے میں میں نے دوپہر ہی اپنے ایک ساتھی سے دریافت کر لیا تھا کہ وہ آبادی کے کس حصے میں واقع ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے استفسار پر میرے ساتھی نے مجھے چونک کر دیکھا تھا۔ کچھ ایسی نظروں سے جیسے اسے میری دماغی صحت پر شبہ ہو۔ لیکن میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

منڈی کے قریب پہنچ کر میں نے راستے کا تعین کیا ——— پھر بائیں ہاتھ والے راستے پر چل پڑا۔ آبادی کا حصہ زیادہ گنجان نہیں تھا۔ اس لئے مطلوبہ حویلی تلاش کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی حویلی کے قریب پہنچ کر میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ باہر سے وہ عمارت خاصی پرانی ہو گئی تھی۔ جگہ جگہ سے پلاسٹر بھی اکھڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ رنگ و روغن بھی پھیکا پڑ چکا تھا۔ اس کے علاوہ ایک عجیب سی ویرانی بھی مسلط تھی۔ میں ابھی پھاٹک کے قریب کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ اندر جاؤں یا نہ جاؤں کہ حویلی سے اسی عورت کی آواز سنائی دی۔

"اندر آ جاؤ' احمد دین۔"

میں نے کچھ سوچے سمجھے بغیر قدم آگے بڑھا دیئے حویلی کا صدر دروازہ بھی بڑا پرانا نظر آ رہا تھا لیکن صدر دروازے سے گزر کر جب میں نے اندرونی ہال میں قدم رکھا تو دنگ رہ گیا۔ یہاں سلیقے اور سجاوٹ کا جو منظر مجھے نظر آیا وہ آج تک میری نظروں سے کبھی نہیں گزرا ہر شے قیمتی اور نایاب تھی۔ جس کا تصور بھی کسی عام آدمی کے لئے محال ہوتا ہے۔ اس قیمتی سازو سامان کو دیکھ کر مجھے شبہ ہوا کہ یہ ضرور کسی اسمگلر کی حویلی ہے جس نے ناجائز تجارت کے ذریعے بیش بہا اور نادر اشیا جمع کر رکھی ہیں۔ میں حیرت سے کھڑا وہ چیزیں دیکھ رہا تھا کہ پھر اسی عورت کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"احمد دین۔ بیٹھ جاؤ۔"

میں نے چونک کر بائیں جانب دیکھا تو وہی عورت اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ میرے سامنے کھڑی تھی۔ گزشتہ شب تاریکی کی وجہ سے میں اس کا چہرہ واضح طور پر نہیں دیکھ سکا تھا۔ لیکن اس وقت روشنی میں کھڑی وہ کوئی اپسرا معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے سرخ ریشمی ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ اس کا بلاؤز تنگ تھا۔ اس کے جسم میں رعنائیاں ہی رعنائیاں تھیں۔ میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ میں خواب میں بھی اتنی حسین عورت کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو کوئی حور تھی۔ قدرت نے غالباً" اسے اپنے ہاتھوں سے حسن کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ میں اس کی آنکھوں کے سحر میں ڈوب چکا تھا۔ میرے دل کی رفتار تیز ہو گئی ——— اس کے یاقوتی ہونٹوں کو دوبارہ جنبش ہوئی۔

"احمد دین۔ میں تمہاری ہی منتظر تھی ...... مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔"

"میں اس وقت تمہارا شکریہ ادا کرنے کی غرض سے آیا ہوں۔" میں نے اپنے ہوش و حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "کل رات تم نے مجھے جس خطرے سے آگاہ کیا تھا وہ درست نکلا۔"

میری بات سن کر وہ مسکرائی تو مجھے ایسا لگا جیسے کائنات کا سارا حسن اس کے چہرے پر سمٹ آیا ہو بہت دیر تک وہ مجھ سے ہمکلام رہی۔ میری خاطر تواضع کرتی رہی اور مجھے ٹھاکر اور پرشوتم کے بارے میں بتاتی رہی لیکن میں صرف اور صرف اس کے

بارے میں جاننے کے لئے بے چین تھا کہ وہ آخر کون تھی جس نے پہلے میری جان بچائی اور پھر میرے دل و دماغ پر جادو کر دیا۔

"تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔" وہ خاموش ہوئی تو میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"اتنی جلدی کیا ہے۔ رفتہ رفتہ تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

"اس حویلی میں تمہارے سوا اور کون رہتا ہے؟"

"کوئی نہیں۔ میں یہاں بالکل تنہا رہتی ہوں۔" عورت کے چہرے پر اداسی کی ایک جھلک نمودار ہوئی۔

"کیا اس دنیا میں تمہارا کوئی نہیں۔"

"نہیں۔" اس نے الجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ پھر مجھے دیکھ کر خوابناک لہجے میں بولی "اب تم ملے ہو تو مجھے خیال ہو رہا ہے کہ میری تنہائی دور ہو جائے گی۔"

میں اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر خوشی سے جھوم اٹھا۔ مجھے اپنی قسمت پر رشک آ رہا تھا کہ اتنی حسین اور مالدار عورت مجھے اپنا محبوب بنانے پر خود آمادگی کا اظہار کر رہی ہے۔ بہت جلد میں اس سے بے تکلف ہو گیا اور میں نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا کہ نہ معلوم وہ مجھ سے کیا برتاؤ کرتی ہے۔ مجھے اس بات کا خطرہ تھا کہ میری غربت کا حال جان کر کہیں وہ مجھے نفرت سے دھتکار نہ دے لیکن اس کے برعکس میری روداد سن کر وہ پہلے کے مقابلے میں کچھ زیادہ مہربان ہو گئی۔ جب تین چوتھائی رات بیت گئی اور میں مجبوراً جانے کے لئے کھڑا ہوا تو وہ میرے ساتھ صدر دروازے تک آئی۔ رخصت کرتے ہوئے اس نے مجسم التجا بن کر پوچھا۔

"احمد دین! کل آؤ گے نا۔"

"اگر تم بلاؤ گی تو ضرور آؤں گا۔"

"ضرور آنا۔ میں تمہارا انتظار کروں گی لیکن بارہ بجے سے پہلے نہ آنا۔"

میں اقرار میں گردن کو جنبش دیتا ہوا حویلی سے رخصت ہو کر واپس اپنی کوٹھری میں آ گیا۔ بستر پر سونے کے ارادے سے لیٹا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے جو کچھ میں

نے دیکھا وہ خواب سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ لیکن وہ خواب نہیں تھا ایک زندہ حقیقت تھی جس کا یقین مجھے دوسری رات آ گیا۔

دن میں نے تڑپ تڑپ کر گزارا اور حسب وعدہ جب میں نصف رات گزارنے کے بعد اس کی حویلی پر گیا تو آج وہ سراپا انتظار بنی مجھے بیرونی پھاٹک پر کھڑی ہوئی مل گئی۔ کل رات کے مقابلے میں آج وہ مجھ پر زیادہ مہربان تھی۔ اس نے میرے لئے انواع و اقسام کی چیزیں میز پر چن دی تھیں اور بڑے اصرار سے مجھے ہر چیز اپنے ہاتھوں سے کھلا رہی تھی۔ اس وقت میں اپنے آپ کو کوئی الف لیلوی شہزادہ سمجھ رہا تھا۔ اس حسین عورت کا قرب پا کر میں سب کچھ بھول گیا تھا حتیٰ کہ اپنی غربت بھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ پہلی عورت تھی جو میری زندگی میں داخل ہوئی تھی اور بڑے بھرپور انداز میں میرے ذہن پر بادلوں کی طرح چھاتی جا رہی تھی۔۔

میں اس کے اصرار پر جو وہ کھلاتی رہی کھاتا رہا پھر بڑی ہمت کر کے میں نے بھی ایک سیب اٹھایا اور اسے کھلانے کی کوشش کی لیکن اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔ میرا دل بجھ کر رہ گیا۔ میں نے اداس نظروں سے اس کی سمت دیکھا تو وہ میرے دل کا راز بھانپ گئی اور مسکرا کر بولی۔

"احمد دین! ناراض نہ ہونا۔ تمہاری خاطر میں اپنی زندگی بھی قربان کر سکتی ہوں۔"

"پھر تم نے میرے ہاتھ سے سیب کھانے سے کیوں انکار کر دیا۔" میں نے ناراضگی کا اظہار کیا تو وہ سرک کر میرے اور قریب آ گئی۔ میں نے اس کے جسم کا گداز محسوس کیا اور پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ میں زندگی کی کن مسرتوں سے محروم تھا۔ وہ میرے اور قریب آئی اور اپنی مرمریں بانہیں میری گردن میں ڈال کر جذبات انگیز لہجے میں بولی۔

"میں آج کل صرف دودھ پر گزارا کر رہی ہوں احمد دین۔ تم اگر مجھے اپنے ہاتھوں سے دودھ پلا دو تو میں خوشی سے پی لوں گی۔"

میں نے جھٹ میز پر سے دودھ کا گلاس اٹھا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اسے نے ایک ہی سانس میں پورا گلاس ختم کر دیا پھر اپنی نشیلی آنکھوں سے مجھے تکتے ہوئے

بولی۔

"احمد دین! تمہیں پا کر میں اپنا سارا دکھ درد بھول گئی ہوں۔ کاش ہم ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ہو سکتے۔"

اس کے آخری جملے میں چھپا ہوا درد محسوس کر کے میں بے چین ہو گیا۔ حالانکہ میں آج تیسری بار اس سے ملا تھا لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم ایک دوسرے سے برسوں سے واقف ہیں۔ اس کی گداز بانہیں بدستور میرے گلے میں حمائل تھیں اور اس کی آنکھیں ابھی تک میرے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں اور میں اس کے سانسوں کی خوشبو سے مدہوش ہوا جا رہا تھا۔ وہ میرا جواب سننے کے لئے مضطرب نظر آ رہی تھی۔ مجھے ایک دم اپنی بے بسی اور بدحالی کا خیال آیا اور میں نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔

"تم میرے ساتھ خوش نہ رہ سکو گی۔ میں ایک مفلس اور قلاش آدمی ہوں اور تم۔"

"احمد دین" وہ تیزی سے بولی "دولت محبت کی کسوٹی نہیں ہوتی۔"

میں اس کا جواب سن کر لاجواب ہو گیا۔ تھوڑی دیر خاموش بیٹھا رہا پھر میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

"تم نے ابھی تک مجھے اپنا نام نہیں بتایا نہ ہی یہ بتایا کہ تم کون ہو اور کس فرقے سے تعلق رکھتی ہو۔"

"میرا نام ———— میرا نام ———— رادھیکا ہے۔" اس نے رک رک کر کہا پھر بڑی شدت سے مجھے لپٹا کر بولی۔ "تم اگر مجھے اپنانے پر آمادہ ہو جاؤ تو میں مسلمان ہونے کو تیار ہوں۔"

رادھیکا کے قرب نے مجھے مدہوش کر رکھا تھا قریب تھا کہ میں اس کی پیش کش قبول کر لیتا۔ مگر مجھ پر کمتری کا احساس غالب آ گیا۔ میں یہ سوچنے لگا کہ میں نے اسے اپنا لیا تو لوگ کہیں گے کہ میں نے دولت کی خاطر ایسا کیا ہے۔ اپنے ذہن کی اس کشمکش نے مجھے اور پریشان کر دیا۔ میرا دم نہ جانے کیوں گھٹنے لگا۔

"احمد دین' مجھے ٹھکرا نہ دینا۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

"میں بہت غریب آدمی ہوں رادھیکا۔ لوگ مجھ پر انگلیاں اٹھائیں گے۔" میں نے

اداسی سے جواب دیا۔

"احمد دین ———— میں تمہیں ایک ایسا طریقہ بتا سکتی ہوں جس سے تم بہت جلد مالدار بن سکتے ہو لیکن ڈرتی ہوں کہ کہیں تم اپنی جان نہ گنوا بیٹھو۔"

ایسا کون سا طریقہ ہے جس سے میں اتنی جلدی مالدار بن سکتا ہوں۔ مجھے فوراً بتا دو۔ تمہیں حاصل کرنے کے لئے میں دہکتی ہوئی آگ میں بھی کود سکتا ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ وہ طریقہ کیا ہے جس سے میں دولت حاصل کر سکتا ہوں۔ تمہیں اپنانے کے لئے میں سب کچھ کر گزروں گا۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"اگر تم اصرار کرتے ہو تو میں تمہیں بتا دوں گی۔ لیکن اس شرط پر کہ جب تک تم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو جاؤ۔ اس بات کا اظہار کسی پر نہ کرنا۔"

"منظور ہے ————" میں نے بڑی اپنائیت سے جواب دیا۔

"اچھا ———— کل میں تمہیں وہ طریقہ بھی بتا دوں گی۔" رادھیکا بڑی سنجیدگی سے بولی۔

"آج بتانے میں کیا ہرج ہے۔"

"آج نہیں ———— کل۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا پھر بڑے والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔

میں نے مزید اصرار نہیں کیا۔ تین پہر رات گزری تو میں رادھیکا سے اجازت لے کر واپس اپنی کوٹھری کی سمت چل پڑا۔ راستے بھر میں اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں نے اپنے دل میں مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ ہر قیمت پر اسے اپنا لوں گا۔ وہ میرے احساس پر کچھ اس طرح حاوی ہو گئی تھی کہ میں اس کے سوا اور کچھ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ رات بھر میں بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح اٹھ کر میں اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا لیکن کسی کام میں دل نہ لگتا تھا۔ خدا خدا کر کے دن ختم ہوا تو مجھے نصف رات گزرنے کا انتظار کرنا پڑا۔ ایک ایک لمحہ اور ایک ایک پل میرے لئے کاٹنا محال ہو رہا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اب رادھیکا کے بغیر میری زندگی نامکمل ہے۔ میں اس کے بغیر ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔

جب رات کے بارہ بجے تو میں بے تابانہ نرنجن لال کی حویلی کی طرف چل پڑا۔

رادھیکا میری منتظر تھی دیکھتے ہی سراپا اشتیاق بن کر مجھ سے لپٹ گئی پھر میرا ہاتھ تھام کر مجھے اندر لے گئی۔ کل کی طرح وہ مجھے قسم قسم کی چیزیں اپنے ہاتھوں سے کھلاتی رہی میں نے اصرار کیا تو آج بھی اس نے دودھ پینے پر اکتفا کی۔ میں آج کچھ زیادہ ہی مضطرب تھا۔ میں نے اسے اپنے ہاتھ سے دودھ پلانے کے بعد پہلا سوال کیا۔

"آج تم نے مجھے کچھ بتانے کا وعدہ کیا تھا۔"

"ہاں ———— لیکن ڈرتی ہوں کہ کہیں تم کسی خطرے میں نہ پھنس جاؤ۔"

"اس کی فکر نہ کرو" میں نے کہا "تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اس کے بعد میرا کام ہے اگر قسمت میں ہمارا ملاپ لکھا ہے تو ہر مشکل آسان ہو جائے گی۔ ورنہ ہم کتنے ہی ہاتھ پاؤں ماریں کچھ نہ ہو گا۔ یوں بھی اب میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

رادھیکا مجھ سے بے اختیار لپٹ گئی۔ میں نے جب بہت زیادہ اصرار کیا اور اپنی جان کی قسم کھائی تو اس نے میری نظروں میں نظریں ڈال کر کہنا شروع کیا۔

"احمد دین ———— یہ راز جو میں آج تمہیں بتا رہی ہوں ایک عرصے سے مجھے معلوم ہے لیکن میں نے کسی اور کو نہیں بتایا۔ مگر میں چاہتی ہوں کہ تم بڑے آدمی بن کر مجھے اپنا لو۔ کام جان جوکھوں کا ضرور ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ تم ضرور کامیاب ہو گے "من" حاصل کر لینے کے بعد تم اتنی دولت کے مالک بن جاؤ گے جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"من" میں نے تعجب سے کہا "یہ کیا بلا ہوتی ہے۔"

"من کو تم پارس پتھر بھی کہہ سکتے ہو ————" رادھیکا نے بدستور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے کہا "سانپوں میں ایک قسم اجگر کی ہوتی ہے جب کوئی اجگر پانچ سو سال پرانا ہو جاتا ہے تو من حاصل کر لیتا ہے جسے وہ اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ اندھیری راتوں میں جب اجگر مست ہوتا ہے تو کسی ویران اور سنسان مقام پر جا کر وہ من کو منہ سے نکالتا ہے اور اس سے کھیلتا ہے اور جب اس کا دل بھر جاتا ہے تو من کو دوبارہ اپنے منہ میں رکھ لیتا ہے۔ من' اجگر کے منہ سے نکلتے ہی روشن ہو جاتا ہے۔ تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اس کی روشنی کس قدر

تیز ہوتی ہے۔"

رادھیکا نے من' کے بارے میں تفصیل بتائی تو سب کچھ سمجھ گیا۔ میں نے اکثر بزرگوں سے سانپ کے من کے بارے میں سن رکھا تھا اور یہ بھی سنا تھا کہ اسے حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ لیکن اس وقت میں نے کچھ نہیں کہا۔ رادھیکا کی نشیلی نظروں نے مجھ پر سحر کر رکھا تھا جو کچھ وہ کہتی رہی میں مدہوشی کے عالم میں بیٹھا سنتا رہا۔

"یہاں سے تین فرلانگ کے فاصلے پر چیل کا پل واقع ہے جہاں کچی سڑک پر دونوں سمت گنے کے کھیت موجود ہیں۔ میری بات اچھی طرح ذہن نشین کرتے رہو۔" رادھیکا نے کہا "چیل کے پل پر پہنچ کر تمہیں الٹے ہاتھ پر ایک کچا ہوٹل ملے گا اس ہوٹل اور کھیت کے درمیان سے ایک پتلا کچا راستہ جاتا ہے۔ تم اسی راستے پر ایک میل اندر چلے جانا اور پھر تمہیں سب کچھ خود معلوم ہو جائے گا۔ لیکن ایک بات اور دھیان میں رکھو۔ اگر من' سے کھیلتے وقت اجگر کی نظر تم پر پڑ گئی تو تمہیں ڈباؤ پانی میں بھی نہیں چھوڑے گا۔ اس لئے تمہیں بہت محتاط رہنا ہو گا۔ یہ بہت احتیاط' جان جوکھم میں ڈالنے کا کام ہے۔ میں تمہیں ایک بڑا توا دوں گی جب تم اجگر کے قریب پہنچ جاؤ تو کسی محفوظ جگہ پر یا درخت پر چھپ جانا۔ ایسی قریبی جگہ پر جہاں تم آسانی سے یہ توا من پر ڈال سکو۔ اجگر من کی واپسی کے لئے غضبناک ہو کر توے پر سر مارتا رہے گا اور اس کے حصول کے لئے سر پٹخ پٹخ کر مر جائے گا۔ اس کے بعد من کو تم میرے پاس لے آنا۔ باقی باتیں میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔ بولو احمد دین! کیا تم اس کام کے لئے تیار ہو جاؤ گے۔ کیا مجھے پانے کے لئے تم من لانے کا عزم کرو گے۔"

"ہاں۔" میں نے اسی مدہوشی کے عالم میں جواب دیا۔

"مجھے یقین تھا کہ ضرور آمادہ ہو جاؤ گے۔" رادھیکا نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا "آج کی رات تمہاری کامیابی کی رات ہے۔ تم اسی وقت اپنی کامیابی کی مہم پر روانہ ہو جاؤ تاکہ ہمارے ملاپ کی گھڑیاں زیادہ طویل نہ ہوں۔"

رادھیکا کے قرب' اس کی باتوں اور اس کی نشیلی آنکھوں میں خدا جانے وہ کون سا جادو تھا جس کے اثر سے میں بغیر سوچے سمجھے اس مہم پر جانے کو تیار ہو گیا۔

رادھیکا نے جو توا مجھے دیا وہ گھروں میں روٹی پکانے والے توے سے کچھ زیادہ وزنی اور بڑا تھا۔ توے کے ایک جانب بڑی بڑی نوکیلی کیلیں موجود تھیں۔ میں نے وہ توا لیا اور حویلی سے باہر نکل کر چیل کے پل کی طرف چل پڑا۔

چیل کا پل میری دیکھی بھالی جگہ تھی۔ عام طور پر ناجائز تجارت کے لئے اسمگلر یہی راستہ اختیار کرتے تھے۔ اس لئے کہ اس کے دونوں اطراف گنے کے گھنے کھیت تھے۔ چیل کے پل سے ملحقہ گاؤں میں اپنے والد کے ساتھ پہلے بھی ایک دو بار آ چکا تھا۔ غرضیکہ میں حویلی سے روانہ ہونے کے بیس منٹ بعد چیل کے پل پر پہنچ گیا۔ یہاں سے چار راستے علیحدہ علیحدہ سمتوں کو جاتے تھے۔ میں نے ایک لمحے کے لئے رک کر الٹے ہاتھ پر واقع اس کچے ہوٹل پر نظر ڈالی جو اس وقت بالکل ویران تھا۔ صرف دو چار کرسیاں باہر پڑی ہوئی تھیں۔ پھر میں ہوٹل اور کھیت کے درمیان گزرنے والے کچے راستے پر ہو لیا اس وقت میرے دل میں کسی قسم کا خوف طاری تھا اور نہ ہی مجھے اس بات کا احساس تھا کہ میری یہ خطرناک مہم میرے لئے کیسی ثابت ہو گی۔ صرف رادھیکا کی نشیلی آنکھوں کا خمار اور اسے پا لینے کی تمنا مجھے کشاں کشاں منزل کی سمت گھسیٹے لئے جا رہی تھی۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

میں نے اپنے اندازے سے ایک میل کا راستہ طے کیا پھر کچے راستے سے ہٹ کر سیدھے ہاتھ کی جانب مڑ گیا اور کچھ دور جا کر ایک گھنے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ میری نظریں سامنے گنے کے کھیت پر تھیں۔ پشت کی سمت تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گھنے درخت اور رات کے سناٹے میں بڑے پر اسرار نظر آ رہے تھے۔ سیدھے ہاتھ پر لق و دق میدان نظر آ رہا تھا۔ میں دعوے کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اس پر اسرار ماحول۔ گہری تاریکی اور ویران مقام پر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو ہوش و حواس کھو بیٹھتا کوئی شخص یہ احمقانہ قدم نہ اٹھاتا۔ بشرطیکہ اس نے رادھیکا کو نہ دیکھا ہوتا۔ رادھیکا کا شمار ان حسین عورتوں میں ہوتا تھا جن کے لئے لوگ بڑے بڑے پہاڑوں کو تن تنہا شکست دے سکتے ہیں اور ایسے غیر معمولی کام کر گزر جاتے ہیں جو انسانوں سے ممکن ہی نہیں۔

میں ماحول سے بے نیاز اس وقت بھی رادھیکا کے حسن جہاں سوز کے تصور میں

غرق تھا کہ یکایک مجھے ایسا لگا جیسے کوئی زور زور سے سانس لے رہا ہو۔ گنے کے کھیت میں سوکھے ہوئے پتوں کی چرمراہٹ ہو رہی تھی۔ میں نے اپنی نگاہیں آواز کی سمت جما دیں لیکن میرا ذہن خوف و خطر سے یکسر عاری تھا۔ تیز تیز سانس لینے کی آواز تھوڑے تھوڑے وقفے سے میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی اور پھر ——— پھر میں نے تاریکی کے باوجود ایک موٹے تازے سانپ کو گنے کے کھیت کی سامنے والی پگڈنڈی سے میدان کی طرف اترتے دیکھ لیا۔ میرا اور اس سانپ کا درمیان فاصلہ مشکل سے پچیس گز ہو گا جو آہستہ آہستہ گھٹتا جا رہا تھا۔ میں سانس روکے اسے دیکھ رہا تھا۔ کھلے میدان میں آ کر سانپ نے رینگنا چھوڑ دیا تو میں بڑی آہستگی سے درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ سانپ کا اور میرا فاصلہ اب محض پندرہ سولہ گز رہ گیا تھا۔ کچھ دیر تک وہ بالکل غیر متحرک رہا پھر میں نے دیکھا کہ وہ اپنا منہ آہستہ آہستہ اوپر اٹھا رہا ہے۔ زمین سے تقریباً" ایک ڈیڑھ فٹ بلند ہونے کے بعد سانپ نے اپنا پھن کاڑھ لیا اور جھومنے لگا۔ میں درخت کی اوٹ میں چھپا حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر تک سانپ سرمستی کے عالم میں جھومتا لہراتا رہا پھر اچانک میں نے اس کے منہ سے روشنی کا ایک گولا نمودار ہوتے دیکھا تھا جو ٹینس کی گیند سے چھوٹا تھا۔ اس کی روشنی رادھیکا کے کہنے کے مطابق بہت تیز تھی۔ میں حیرت و استعجاب کے عالم میں کھڑا سانپ کو اس گیند سے کھیلتا دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ سانپ اجگر ہی ہے جو اس وقت من سے کھیل رہا ہے۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں لیکن خوف اب بھی مجھ پر غالب نہ آ سکا۔

اجگر اپنے من سے کھیل رہا تھا۔ وہ من کو اوپر اچھال دیتا پھر جھومنے لگتا اور جب من نیچے آتا تو وہ دوبارہ اپنا پھن مار کر اسے فضا میں بلند کر دیتا۔ میں نے اپنے بزرگوں سے من کے بارے میں جو کچھ سنا تھا وہ اس وقت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ کسی خاموش تماشائی کی طرح میں اس بھیانک کھیل سے محظوظ ہو رہا تھا کہ یکایک میرے کانوں میں رادھیکا کی آواز گونجی۔

"احمد دین! جلدی کرو ——— اگر تم نے یہ موقع کھو دیا تو پھر تمام زندگی تمہیں پچھتانا ہو گا۔"

اس ویرانے میں رادھیکا کی آواز سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے پھرتی سے گھوم کر دیکھا۔ وہاں میرے اور اجگر کے سوا کوئی نہ تھا۔ وہ آواز غالباً میری اپنی تمناؤں کی ایک بازگشت تھی۔ جس نے مجھے بروقت چونکانے کی سعی کی تھی۔ میں نے دوبارہ اجگر پر نظر ڈالی جو بدستور سرمستی کے عالم میں جھوم جھوم کر من سے کھیل رہا تھا۔ میں بڑی سرعت سے زمین پر پیٹ کے بل لیٹ گیا اور آہستہ آہستہ میں نے اجگر کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ رادھیکا نے جو توا مجھے دیا تھا وہ میرے سیدھے ہاتھ میں تھا۔ میرا وجود ہر لمحہ موت سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ مگر مجھے کسی خطرے کا احساس تک نہ تھا مجھے معلوم تھا اگر اجگر نے میری موجودگی محسوس کر لی تو میرا وہاں سے بچ نکلنا محال ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ میں نے بزرگوں اور سپیروں کی زبانی یہ بھی سن رکھا تھا کہ سانپ کے کان بے حد تیز ہوتے ہیں۔ زمین پر رینگتے ہوئے وہ ایک میل کی آہٹ بھی سن سکتا ہے مگر پھن کاڑھ لینے کے بعد وہ زیادہ دور کی آواز نہیں سن سکتا۔ بہر حال میں ان تمام باتوں سے بے نیاز حشرات الارض کی طرح رینگ رینگ کر آگے بڑھتا رہا۔ میرا اور اجگر کا درمیانی فاصلہ بڑی سست رفتاری سے گھٹتا رہا۔ پھر میں اس سے بارہ چودہ فٹ کے فاصلے پر پہنچ کر ایک درخت کی آڑ میں رک گیا۔ یہاں سے میں بہ آسانی اس توے کو من پر پھینک سکتا تھا۔ لیکن خطرہ اس بات کا تھا کہ میرا نشانہ ذرا بھی خطا کر گیا یا من توے کے نیچے نہ دب سکا تو میری ساری محنت اکارت جائے گی۔

میں یہ سنہری موقع ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ میں ابھی اپنے آئندہ اقدام کے بارے میں غور کر ہی رہا تھا کہ میری نظر اپنے بائیں جانب پڑی ہوئی ایک دو شاخہ لکڑی پر پڑی جو نہ جانے وہاں کب سے پڑی ہوئی تھی مگر اس وقت اسے دیکھ کر میرے ذہن میں ایک ترکیب ابھر آئی۔ میں نے لکڑی کی جانب رینگنا شروع کر دیا اور قریب پہنچ کر لکڑی پر اپنے الٹے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی۔ رادھیکا کا دیا ہوا توا میرے سیدھے ہاتھ میں تھا اور میری نظریں اجگر پر مرکوز تھیں جو مستقل من سے کھیل رہا تھا۔

اب میری سوچی سمجھی اسکیم پر عمل کرنے کا وقت آ چکا تھا۔ میں نے اپنے گھٹنے

پیٹ کی طرف سرکا کر آہستہ آہستہ اوپر کی جانب رینگنا شروع کر دیا تھا۔ اجگر نے ایک بار جب پھن مار کر من اوپر پھینکا تو میں برق رفتاری سے اچھل کر بیٹھ گیا۔ الٹے ہاتھ میں دبے ہوئے لکڑی کے دوشاخے کو میں نے زور سے پھن کا نشانہ لے کر پھینکا۔ میرا وار خالی نہیں گیا۔ دوشاخہ اجگر کے پھن سے ٹکرایا تو اجگر ایک طرف جھول گیا۔ عین اسی وقت من زمین پر گرا اور میں نے خدا کا نام لے کر توا اس کی جانب اچھال دیا۔ ویران سناٹے میں توا گرنے کی آواز ابھری پھر گہری خاموشی مسلط ہو گئی۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ میرا دوسرا نشانہ بھی خطا نہیں ہوا۔ لیکن میں نے اس کا انداز لگانے کے لئے رکنے کی حماقت نہیں کی بلکہ تیزی سے پلٹ کر ابی درخت کی سمت بھاگنا شروع کر دیا جس کی اوٹ میں چھپا کھڑا تھا۔ درخت کے قریب پہنچ کر میں نے اچھل کر اس کی شاخ پکڑی اور ٹانگیں سکیڑ کر اوپر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اب میں کسی حد تک محفوظ تھا۔

درخت پر چڑھنے کے بعد میں نے نظر گھما کر اجگر کی طرف دیکھا تو پہلی مرتبہ خوف سے جسم کے سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اجگر غضب کی حالت میں اپنا سر اٹھا اٹھا کر توے پر مار رہا تھا۔ اس کی پھنکار کی تیز آواز یقیناً دور دور تک سنی جا رہی ہو گی۔ میں درخت پر دبکا ہوا یہ خوفناک منظر دیکھتا رہا۔ من کو دوبارہ حاصل کر لینے کی تمنا نے اجگر کو دیوانہ بنا دیا تھا اور یہ دیوانگی اس کی موت کا سبب بن گئی۔ اس کے توے پر سر مارنے میں سستی پیدا ہونی شروع ہو گئی پھر کچھ دیر بعد وہ بالکل ساکت ہو گیا۔ اس کا جسم اب رفتہ رفتہ اکڑنا شروع ہو گیا تھا۔ سانس کی آواز بھی تھم چکی تھی۔ میں اپنی جگہ بیٹھا یہ تمام تماشا دیکھتا رہا۔ پھر جب بہت دیر تک اجگر نے کوئی حرکت نہ کی تو درخت سے نیچے اترا اور یہ یقین کر لینے کے لئے کہ وہ موذی جانور مر گیا ہے یا نہیں۔ میں نے دو چار پتھر اٹھا کر اس کی طرف پھینکے۔ جب اجگر نے کوئی معمولی حرکت بھی نہ کی تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مر چکا ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دوبارہ اس کی سمت بڑھنا شروع کر دیا۔

رادھیکا نے جو کچھ کہا تھا وہ ٹھیک ثابت ہوا قریب جا کر جو کچھ میں نے دیکھا اس سے میں لرز اٹھا اجگر کا وزنی سر قیمہ ہو چکا تھا۔ اس کا پھن توے کی کیلوں سے الجھا

ہوا بے حس و حرکت تھا۔ پھر بھی میں نے احتیاطاً" لکڑی کے دوشاخے کی مدد سے اس کا وزنی سر توے سے علیحدہ کیا اور ———— جھک کر اس گولے کو اٹھا لیا جو تپتے لوہے کی طرح گرم ہو رہا تھا اپنی قمیض اتار کر میں نے من کو اس میں احتیاط سے لپیٹا پھر بے تحاشا نرنجن لال کی حویلی کی سمت دوڑنے لگا۔ راستے میں کئی بار مجھے ٹھوکر لگی۔ میں جلد سے جلد رادھیکا کے پاس پہنچ کر من حاصل کرنے کی خوشخبری سنانا چاہتا تھا۔ رادھیکا مجھے بیرونی پھاٹک پر مل گئی۔ وہ بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔

"مجھے یقین تھا احمد دین کہ تم ضرور کامیاب ہو گے" مجھے دیکھتے ہی وہ خوشی سے دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی پھر اس نے من کو میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ اسے وہ چومنے لگی۔ اس کا اشتیاق اتنا بڑھا کہ اس نے اسے منہ میں ڈال لیا اور بولی۔

"اب تم جاؤ ———— کل ضرور آنا۔ کل ہمارے ملاپ کا دن ہو گا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے حویلی کے اندر چلی گئی۔

مجھے رادھیکا کا یہ طرز عمل گراں گزرا لیکن یہ سوچ کر کہ ممکن ہے رات زیادہ گزر جانے کی وجہ سے اس نے مجھے حویلی کے اندر آنے کی دعوت نہ دی ہو۔ میں ہانپتا ہوا اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ اپنی کوٹھری میں پہنچ کر مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ آج میں نے جو مہم سر کی ہے وہ کس قدر خوفناک تھی۔ یہ رادھیکا کے بے مثال حسن کا ہی اعجاز تھا ورنہ میں کبھی اس خطرناک مہم میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے کل کا انتظار تھا۔ اس کل کا جس میں ایک حسین عورت میری ملکیت بننے والی تھی۔ پھر میں ایسا سویا کہ صبح کی خبر لی۔

دوسرا دن میں نے بڑی بے چینی کے عالم میں گزارا رات آئی تو میں نے غسل کیا ایک اجلا جوڑا پہنا اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے حویلی کی طرف چل دیا۔ میرے دل و دماغ پر سحر سا طاری تھا۔ رادھیکا آج میری ہونے والی تھی۔ اس تصور کی حلاوت نے میرے ذہن پر قرمزی رنگ بکھیر دیئے تھے مگر حویلی کے بڑے پھاٹک پر پہنچ کر میں اداس ہو گیا۔ توقع کے خلاف آج رادھیکا میرے استقبال کے لئے وہاں موجود نہیں تھی۔ حویلی پر آج زیادہ ویرانی مسلط تھی۔ در و دیوار سے وحشت اور ویرانی برس رہی تھی۔ میں بجھے بجھے دل سے اندر داخل ہوا۔ حویلی کا صدر دروازہ کھول کر اندر قدم

رکھا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ ہال جہاں کل تک قیمتی سازو سامان موجود تھا آج بالکل اجاڑ اور ویران پڑا تھا۔ میں حیرت سے اس کھنڈر جیسے ہال کو ادھر ادھر سے دیکھتا رہا اور اس کمرے میں داخل ہوا جہاں رادھیکا میری ضیافت کرتی تھی لیکن میرے خدا ———— اس کمرے میں پہلا قدم رکھتے ہی میں سر تا پیر لرز اٹھا۔ میری آنکھیں دہشت سے پھٹ گئیں۔ بڑے ہال کے اس کمرے میں بھی کوئی سازو سامان موجود نہیں تھا۔ کمرے کے بیچوں بیچ اکھڑے ہوئے فرش پر ایک سیاہ رنگ کی ناگن پھن اٹھائے من سے کھیل رہی تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح کل رات میں نے اجگر کو سرمستی کے عالم میں اس سے کھیلتا پایا تھا۔ وہ من اسی سائز کا تھا جو میں نے کل رات اپنی زندگی داؤ پر لگا کر اجگر سے حاصل کیا تھا۔

مجھ پر لرزہ طاری تھا۔ مجھے سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ میں بے تحاشا پلٹا اور بھاگنے کے لئے اپنے بوجھل قدموں کو جنبش دینا چاہتا تھا کہ یکایک کمرے میں گھپ اندھیرا پھیل گیا اور سیاہ ناگن کی پھنکار مجھے اپنے قریب محسوس ہونے لگی وہ میرے قدموں سے لپٹ گئی اور میرے جسم پر اوپر کی جانب بڑھنے لگی تھی۔ اس نے اپنی زبان نکال کر میرے ہاتھ کو چاٹنا شروع کر دیا۔ میں نے موت کو اتنے قریب پایا تو بوکھلا گیا۔ پوری قوت سے ناگن کے لجلجے جسم کو ہاتھوں سے پکڑ کر ایک طرف پھینکا پھر دیوانہ وار باہر کی طرف دوڑنے لگا لیکن اندھیرے میں کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر منہ کے بل زمین پر آ گیا۔

دوبارہ مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو اپنے پتھورو والے مکان میں پایا۔ صبح ہو چکی تھی۔ علی مردان شاہ میرے قریب ہی کھڑا تھا۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر اس نے کسی قدر ناراضگی سے پوچھا۔

"سائیں احمد ———— تم رات کس وقت واپس آئے تھے۔ اپنے آنے کی اطلاع بھی نہیں دی۔"

میں مردان شاہ کی بات کا جواب دینے کے بجائے اسے دیکھتا رہا۔ میرا ذہن بری طرح الجھ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں پتھورو کس طرح آ گیا۔ حویلی میں گزشتہ رات پیش آنے والا حادثہ کسی ڈراؤنی فلم کی طرح میری نظروں کے سامنے گھوم رہا

تھا۔

"کیا بات ہے سائیں احمد ——— تم کچھ پریشان دکھائی دیتے ہو۔" مردان شاہ نے دوبارہ سوال کیا تو میں ہانپتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ کچھ دیر تک ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ پھر مردان شاہ کو تیزی سے مخاطب کر کے بولا۔

"مردان شاہ ——— اب میں تھرپارکر کے علاقے میں ایک منٹ بھی نہیں رک سکتا۔ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے کہیں اور بھاگ چلو۔"

مردان شاہ نے مجھے نفرت سے گھورتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے تم ناجائز تجارت کرنے والے کسی گروہ میں شامل ہو گئے ہو۔ میں اسی لئے تمہاری اسٹیشن کی ملازمت کے خلاف تھا۔ یہ تم کن لوگوں میں پھنس گئے احمد۔"

مردان شاہ کے لہجے میں تلخی اور ناگواری مجھے بری طرح محسوس ہوئی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے میرے متعلق یہ نتیجہ کیوں اخذ کیا۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا مگر جب اس نے ایک چھوٹا سا صندوق لا کر میرے سامنے رکھا جس میں سونا بھرا ہوا تھا تو میں حیرت زدہ رہ گیا۔ مردان شاہ کی ناراضگی کی وجہ میری سمجھ میں آ گئی۔ وہ میرے سامنے کھڑا سوالیہ نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے سہمے ہوئے لہجے میں رادھیکا سے ملاقات کا پورا واقعہ اسے سنا ڈالا۔ اسے میری بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ مگر مجھے وہ بخوبی جانتا تھا کہ میں نے زندگی میں کبھی اس سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔

اس روز ہم تھرپارکر کو خیرباد کہہ کر دادو چلے گئے۔

آج کل میں حیدر آباد میں مقیم ہوں۔ افسوس کہ مردان شاہ اپنے دوست اور بھائی کے ساتھ آسودہ حالی کے زیادہ دن نہ گزار سکا۔ مردان شاہ جلد ہی مر گیا۔ اپنے عزیز مردان شاہ کی بے وقت موت کا مجھے بے حد ملال ہے۔ جب ساتھ رہنے اور زندگی کا لطف لینے کے دن آئے تو وہ مجھ سے بچھڑ گیا۔ اس کے بعد میں کئی سالوں تک رادھیکا کی تلاش میں نرنجن لال کی حویلی کے چکر کاٹتا رہا۔ مگر وہاں مجھے شکستگی اور ویرانی کے سوا اور کچھ نہ ملا۔ رادھیکا کون تھی؟ مردان شاہ مرحوم الٹی سیدھی توجیہیں کرتا رہتا تھا۔ وہ کوئی بھی ہو۔ میں نے تو اس کے بارے میں کچھ اور ہی سوچا تھا۔ وہ اس سونے اور زمرد جواہرات سے زیادہ قیمتی تھی جو مجھے اس کی ملاقات کے بعد ملے۔ میں سوچتا ہوں، کاش مجھے رادھیکا مل جاتی۔ چاہے اور کچھ نہ ملتا۔



"مایا جال"

میں پٹنہ بہار کا رہنے والا ہوں۔ میرا تعلق جس خاندان سے ہے اس کا شمار کسی زمانے میں بہار کے اعلیٰ خاندانوں میں کیا جاتا تھا۔ میرے دادا خاصے مالدار اور با اثر شخص تھے لیکن ان کی دولت میرے والد کے کسی کام نہ آ سکی اور یوں غربت کے دور نے اس کہانی کو جنم دیا جو آج میں قلم بند کرنے بیٹھا ہوں۔ والد صاحب جو اب اس جہان فانی میں موجود نہیں (خدا انہیں غریق رحمت کرے) ان کے بارے میں مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ میرے دادا نے جو بڑے کروفر کے آدمی تھے میرے والد کو اپنی بڑی جائداد سے اس لئے محروم کر دیا تھا کہ میرے والد نے ان کی مرضی کے خلاف اپنی پسند کی شادی کر لی تھی اور دولت کو ٹھکرا کر نئے سرے سے اپنا گھر آباد کیا تھا۔ اب میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

میری پیدائش 1919ء میں پٹنہ ہی میں ہوئی تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں، میں نے میٹرک کا امتحان اعزازی نمبروں سے پاس کیا اور کالج میں داخل ہو گیا۔ پڑھنے کا شوق اس حد تک تھا کہ میں نے طے کر رکھا تھا کہ بی۔ اے کرنے کے بعد میں اعلیٰ تعلیم کے لئے ضرور باہر جاؤں گا اور اپنے والدین کا سہارا بن جاؤں گا کہ میرے دادا کی آنکھیں بھی چکا چوند ہو جائیں لیکن ابھی میں ایف اے کی تعلیم مکمل کر کے بی۔ اے میں داخلہ لینے کے سنہرے خواب دیکھ رہا تھا کہ میری والدہ جو روز اول ہی سے دھان پان واقع ہوئی تھیں اور آئے دن بیمار رہتی تھیں۔ ان کا انتقال ہو گیا۔ میرے والد کو میری والدہ کی موت کا بے پناہ صدمہ ہوا۔ ادھر والدہ کی موت نے میری کمر بھی توڑ دی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے سنہری خواب بکھر کر رہ گئے۔ جو میں نے سوچا تھا وہ میں نہ کر سکا۔

والدہ کی موت کے کچھ دنوں بعد تک تو والد صاحب کو چپ لگی رہی پھر انہوں نے گھر کی ویرانی کو دور کرنے کے لیے میرا گھر آباد کرنے کی ضد شروع کر دی میں ان کی اس اچانک ضد سے بوکھلا گیا۔ جس لڑکی سے وہ میرا رشتہ کرنے کے خواہشمند تھے اول تو وہ مجھے پسند نہ تھی۔ دوسرے یہ کہ میں کالج کی ایک ہم جماعت لڑکی رئیسہ سے محبت کرتا تھا۔ ہمارے درمیان شادی کے عہد و پیمان بھی ہو چکے تھے۔ اگر کوئی چیز مانع تھی تو وہ میری غربت تھی۔ جس کی وجہ سے میں نے رئیسہ کا ذکر ابھی تک والدین سے نہیں کیا تھا۔ اگر کرتا تو وہ یہی کہتے کہ۔ "جھونپڑی میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھنا حماقت ہے" یا پھر یہ کہ "کے کپڑے میں ٹاٹ کا پیوند کبھی زیب نہیں دیتا۔" مجھے خود بھی اس بات کا احساس تھا کہ میں غلط جگہ اپنے دل کا سودا کر بیٹھا ہوں اس لئے کہ رئیسہ ایک بڑے باپ کی بیٹی تھی اور میں اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھا بہر حال میرے حوصلے بلند تھے۔ میں نے رئیسہ کو اپنانے کے لئے بڑے اونچے منصوبے باندھ رکھے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ جب بی۔ اے کر لینے کے بعد میں باہر سے کوئی اعلیٰ ڈگری لے کر واپس آؤں گا اور کسی اونچے عہدے پر فائز ہوں گا تو رئیسہ کے والدین مجھے اپنا داماد بنانے میں کوئی پس و پیش نہ کریں گے۔ لیکن والدہ کی موت کے بعد جب میرے والد کا اصرار بڑھا تو میں مجبور ہو کر رہ گیا۔ والد صاحب نے صاف طور پر یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اب میں شادی کر لوں اور اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں اگر میری والدہ حیات ہوتیں تو شاید میں والد صاحب سے صاف طور پر انکار کر دیتا لیکن اب جب کے میری والدہ حیات نہیں تھیں اور میرے والد کے مزاج میں بھی چڑچڑا پن آگیا تھا۔ میں نے حالات کے پیش نظر مگر دل برداشتہ ہو کر اس لڑکی سے شادی کر لی جو میرے والد نے پسند کی تھی اس کے ساتھ ہی میں نے تعلیم ترک کر دی اور ڈیڑھ سو روپے کی ملازمت اختیار کر لی۔ رئیسہ کو نہ پا کر میرا دل بھی تعلیم سے اچاٹ ہو گیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ میری شادی کی خبر جب رئیسہ کو ملے گی تو وہ مجھ سے نفرت کرنے لگی گی اور بے وفا سمجھ کر مجھے فراموش کر دے گی لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ شادی کے چھ ماہ بعد ایک روز اچانک سر راہ رئیسہ سے ملاقات ہوئی تو میں نے

کترا کر نکل جانا چاہا۔ اب اس کے سامنے جاتا بھی تو کیا منہ لے کر جاتا لیکن جب رئیسہ نے ازخود مجھے آواز دی تو میں مجبور ہو گیا۔ میں نے یہی سوچا کہ اسے اصلی حالات سے آگاہ کر دوں مگر مجھے اس کا موقع نہ ملا۔ رئیسہ جسے میری شادی کا علم ہو چکا تھا مجھ سے ناراض ہونے کے بجائے افسردہ لہجے میں کہا۔

"مانا کہ اب تم کسی اور کے ہو گئے ہو لیکن میں اس کے باوجود ہمیشہ تمہاری پرستش کرتی رہوں گی۔ محبت تو روح کی بات ہے۔ اس میں جسمانی ملاپ کو کوئی دخل نہیں ہوتا میری دعا ہے کہ تم جہاں بھی رہو ہمیشہ خوش رہو۔"

رئیسہ کے اس رویے نے میرے دل پر جو اثر کیا اس کا اظہار میرے بس میں نہیں۔ اب میرے دل میں ہر وقت ایک خلش سی رہتی۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا اور میں ہر وقت رئیسہ کے بارے میں سوچتا رہتا کہ میری بیوفائی کے باوجود وہ اسی وارفتگی سے چاہتی ہے اور میں مرد ہونے کے بعد بھی مجبور ہو گیا۔ بیوی سے میرے تعلقات بس سرسری سے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اسے اپنے راستے کا روڑا سمجھتا تھا۔ ادھر جب رئیسہ نے مجھے اپنی محبت کا یقین دلایا تو میں اپنی بیوی سے اور دور دور رہنے لگا۔ ہمارے تعلقات روز بروز کشیدہ ہوتے گئے۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ میرا پیچھا چھوڑ دے تا کہ میں رئیسہ کو اپنا سکوں لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ پہلے میرے والد کا انتقال ہوا پھر ہندوستان کے بٹوارے کے مسئلے نے کچھ ایسا زور پکڑا کہ پرسکون ماحول بھی اس کی زد میں آگیا۔ لوٹ مار اور دنگا فساد کا بازار گرم ہوا تو لوگوں کو اپنی عزت بچانی مشکل ہو گئی۔ مسلمان پاکستان کی طرف کوچ کرنے لگے۔ ایک دو بار میری بیوی نے بھی دبی زبان میں کہا کہ اب پٹنہ کی فضا سازگار نہیں اس لئے پاکستان چلے چلو مگر میں نے اس کا کہا ٹال دیا۔ جب تک رئیسہ میری محبت پٹنہ میں موجود تھی میں بھلا ہندوستان کیسے چھوڑ دیتا۔ میری بیوی نے دو چار بار اصرار کیا پھر صبر و شکر کر کے چپ ہو رہی لیکن ایک دن جب میں نے اس کے کہے بغیر ہی پاکستان جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ یہ سوچ کر خوش ہو گئی کہ میں اس کی بات مان گیا ہوں حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ پاکستان جانے کا قصد محض اس وجہ سے میں نے کیا کہ رئیسہ کے والدین بھی پٹنہ کو خیرباد کہہ کر پنجاب کے علاقے کی طرف کوچ کر چکے تھے۔

غرضیکہ 29 اگست 1947ء کو میں اپنا رخت سفر باندھ کر بیوی کے ساتھ پاکستان کی سرحد میں داخل ہوا اور تھوڑی سی تگ و دو کے بعد قصور کے ایک محلے میں مکان حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جو مکان میں نے کرائے پر حاصل کیا تھا وہ بس گزر بسر کرنے کے قابل تھا۔ اس میں دو کمرے تھے جس میں سے ایک کی چھت ٹین کی تھی جو بارش میں ٹپکتی رہتی تھی۔ دوسرا کمرہ قدرے غنیمت تھا۔ کمروں کے سامنے کچا دالان تھا جس پر لکڑی کے ستون کھڑے کر کے ٹین اور پیٹیوں کے تختے جڑ دیئے گئے تھے۔ دالان کے بعد لمبا چوڑا صحن تھا۔ جو سر شام ہی سے بھائیں بھائیں کرنے لگتا۔ بجلی چونکہ اس محلے میں نہیں آئی تھی اس لئے مجبوراً" کیروسین لیمپ استعمال کرنا پڑتا تھا۔ پانی کی قلت تو نہ تھی لیکن اسے حاصل کرنے کے لئے مجھے روز صبح و شام اس نلکے پر جانا پڑتا جو میرے مکان سے پچاس گز دور تھا۔ محلے کے باقی افراد بھی اسی نل سے پانی حاصل کرتے تھے۔

جس مکان میں میں رہتا تھا۔ اس کے صحن میں ایک پرانا کنواں بھی تھا۔ میں نے نل تک جانے سے بچنے کی خاطر اپنے مالک مکان سے کہا کہ کنویں کو کھلوا دیا جائے اور اس کی صفائی کرا دی جائے لیکن مالک مکان جو ایک مقامی باشندہ تھا اس نے میری بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ بلکہ الٹا اس نے کہا کہ اگر مجھے اس مکان میں کوئی تکلیف ہے تو میں دوسرا مکان تلاش کر لوں۔ ان دنوں مکان کی قلت تھی اور پھر میرے پاس جتنی جمع پونجی تھی وہ رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی تھی اور فی الحال میری مالی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں زیادہ کرائے پر کوئی دوسرا مکان لیتا۔ سب سے پہلے میرے لئے ملازمت کا مسئلہ مکان سے زیادہ اہم تھا۔ میں دن بھر ملازمت کی تلاش میں مارا مارا پھرتا اور رات کو تھک ہار کر جب گھر واپس آتا تو بیوی کی صورت دیکھتے ہی مجھے اول تو رئیسہ یاد آ جاتی پھر اپنی تمام تر پریشانیوں کو میں اپنی بیوی کی ذات سے منسوب کر کے اندر ہی اندر سلگ اٹھتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر میری بیوی میرے اور رئیسہ کے درمیان نہ آن ٹپکتی تو مجھے آج اس حالت سے کبھی دو چار نہ ہونا پڑتا۔ میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد کسی بڑے عہدے پر فائز ہوتا۔ میرے پاس کوٹھی ہوتی نوکر چاکر اور گاڑی سب ہی کچھ ہوتا لیکن اب یہ حال تھا کہ کوئی پرسان حال نہ تھا میرے

سارے خواب' خواب ہی رہے۔

تقریباً" ڈیڑھ ماہ تک میں اس رقم پر گزارا کرتا رہا جو پٹنہ سے بھاگتے وقت میرے پاس محفوظ تھی۔ پھر خاصی جد و جہد کے بعد مجھے ملازمت مل گئی۔ ملازمت زیادہ اچھی نہ تھی لیکن کرتا بھی کیا۔ کوئی چار سال تک کسی طرح تنگی ترشی سے اس پر قانع رہا۔ اس دوران مجھے ایک روز اپنے دفتر کے پتے پر ایک خط ملا۔ مجھے یاد ہے کہ خلاف توقع کسی خط کی آمد نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ کچھ دیر میں لفافے کو ہاتھ میں تھامے بغور دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ آخر مجھے خط لکھنے والا کون ہے اس لئے کہ میرا پتا کسی کو معلوم نہیں تھا پھر میں نے خط چاک کر کے اندر سے تہہ شدہ کاغذ نکال کر دیکھا تو میرا دل بڑی طرح دھڑکنے لگا۔ یہ خط میری رئیسہ کا تھا۔ جو میرے ذہن اور اعصاب پر ہر وقت سوار رہتی تھی۔ میں نے یہ سوچے بغیر کہ رئیسہ کو میرا پتا کیوں کر معلوم ہوا خط پڑھنا شروع کیا۔ رئیسہ نے لکھا تھا۔

میرے ———— ہمیشہ خوش رہو!

جس افراتفری کے عالم میں ہم لوگ پٹنہ سے روانہ ہوئے اس کا حال ممکن ہے تمہیں نہ معلوم ہو لیکن وہ کچھ ایسا ہی عالم تھا کہ میں کوشش کے باوجود روانگی کے وقت تم سے ملاقات نہ کر سکی۔ اور اپنے تصورات میں تمہیں خدا حافظ کہہ کر اس شہر کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو گئی جہاں ہماری محبت پروان چڑھی تھی اور ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ عہد و پیمان باندھے تھے۔ مجھے اس زمانے کی ایک ایک بات یاد ہے۔ ہو سکتا ہے تم ان باتوں کو بھول گئے ہو۔ کون جانے!

آج اتفاق سے تم پر نظر پڑ گئی۔ خدا گواہ ہے کہ تمہیں چار سال بعد اچانک دیکھ کر مجھے کس قدر خوشی ہوئی۔ میرا دل چاہا کہ گاڑی روک کر تم سے دو باتیں کر لوں۔ لیکن پھر ہمت نہ ہوئی۔ ڈر تھا کہ کہیں تم مجھے بالکل ہی نہ بھول گئے ہو۔ بہر حال دل نہ مانا تو میں نے تمہارے دفتر کا پتا معلوم کر لیا۔ جس پر

تمہیں یہ خط روانہ کر رہی ہوں!

میرے .... سب کچھ بدل گیا ہے مگر میں نہیں بدلی۔ میں نے تمہیں آج کیا دیکھا۔ سارے زخم تازہ ہو گئے۔ میں نے اپنی تمام زندگی تنہائیوں میں بسر کرنے کا عزم کیا ہے۔ تمہیں یاد ہو گا کہ میں نے تم سے کہا تھا۔ میں اب شادی نہیں کروں گی۔ میں اب بھی اس فیصلے پر قائم ہوں۔ والدین بھی اب میری ضد پر آمادہ ہو ہی گئے ہیں۔

تم اپنی سناؤ۔ تمہارا کیا حال ہے۔ تمہاری بیوی تو تم سے بہت خوش ہو گی ہونا بھی چاہئے اس لئے کہ اسے تم جیسا شوہر جو ملا ہے۔ خدا تم دونوں کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے آمین!

———— تم شاید سوچ رہے ہو گے کہ میں تم پر طنز کرنے کی خاطر ایسی باتیں لکھ رہی ہوں لیکن خدا کی قسم ایسا نہیں ہے اور میں اگر چاہوں بھی تو ایسا نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ اب مجھے تمہارے اوپر حق ہی کہاں ہے۔

کوشش کروں گی کہ پھر کبھی تم سے مل سکوں۔ لیکن کیا تم دو گھڑی اپنی رئیسہ سے انہی دھڑکنوں کے ساتھ گفتگو کرنا گوارا کرو گے جیسے شادی سے پہلے کیا کرتے تھے۔ اپنا پتا میں تمہیں ملاقات کے وقت ہی بتاؤں گی۔

اچھا خدا حافظ

ہمیشہ تمہاری

رئیسہ

رئیسہ کا خط پڑھ کر ماضی کے تمام زخم ہرے ہو گئے جس خوبصورت انداز میں رئیسہ نے میرا مذاق اڑایا تھا اسے محسوس کر کے میں تڑپ اٹھا اور بیماری کا بہانہ کر کے اپنے افسر سے رخصت حاصل کر کے گھر چلا آیا۔ میری بیوی نے مجھے قبل از وقت گھر واپس آتے دیکھا اور میرے چہرے کو اداس پایا تو پریشان ہو کر بولی۔

"کیا بات ہے۔ آج آپ کچھ پریشان پریشان سے نظر آ رہے ہیں۔"

"ہاں۔ میری طبیعت اس وقت ٹھیک نہیں۔"

"کیا محسوس کر رہے ہیں آپ۔ کسی ڈاکٹر کو دکھایا؟" میری بیوی نے پیار سے پوچھا تو میں چیخ اٹھا۔

"دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے میری بربادی کا سبب تمہاری ہی منحوس ذات ہے۔"

بیوی کے دل پر میرے ان جملوں کا کیا اثر ہوا مجھے اس وقت اس کا کوئی احساس نہ ہوا۔ ہوتا بھی کیسے میں اپنے حسین ماضی میں گم تھا۔ میں بیوی کو نفرت سے دھتکار کر اپنے کمرے میں آ گیا اور سارا دن اپنے بستر پر پڑا رئیسہ کے بارے میں سوچتا رہا جس نے محض میری خاطر آج تک شادی نہیں کی تھی۔ اور آیندہ کے لئے بھی کنواری رہنے کی قسم کھا لی تھی اور یہ سب میری وجہ سے ہوا تھا۔ میں رئیسہ کے ساتھ کئے ہوئے وعدوں پر قائم نہ رہ سکا لیکن وہ آج تک اپنے عہد پر ثابت قدمی سے جمی ہوئی تھی۔ جس قدر میں سوچتا تھا اسی قدر میرا ذہن پریشان ہوا جاتا تھا۔

رئیسہ کے خط نے میری اس خواہش کو دوبارہ اکسایا جو پہلے بھی ایک بار ابھر چکی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اگر کسی طرح میں اپنی بیوی سے چھٹکارا حاصل کر لوں تو اب بھی رئیسہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہوں تمام دن اور تمام رات میں اسی خیال میں الجھا رہا کہ اپنی بیوی سے کس طرح نجات حاصل کی جائے۔ دوسرے دن آفس کے راستے میں بھی میری مضطرب نگاہیں ہر گزرنے والی گاڑی پر اٹھتی رہیں کہ شاید کہیں رئیسہ مجھے مل جائے لیکن میری بدنصیبی کہ وہ مجھے کہیں نہ ملی۔

دس پندرہ دنوں تک میں رئیسہ کو پورے قصور کے علاقے میں تلاش کرتا رہا مگر اس کا پتا دریافت نہ کر سکا۔ مجھے یقین تھا کہ رئیسہ اب بھی قصور میں یا اس کے نواح میں کہیں مقیم ہو گی اس لئے کہ رئیسہ کا خط جس لفافے میں آیا تھا اس پر قصور ہی کے ایک ڈاکخانے کی مہر لگی ہوئی تھی۔ جیسے جیسے دن گزرتے جاتے۔ میری بے چینی اور پریشانی بڑھتی جاتی تھی۔ ایک طرف تو میں رئیسہ سے ملنے کے لئے پریشان تھا اور دوسری طرف یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ اگر رئیسہ مجھے مل گئی اور اس نے میرے

اصرار پر میرے ساتھ شادی کرنے پر اپنی رضا مندی کا اظہار کر دیا تو میں اپنی بیوی سے چھٹکارا کس طرح حاصل کروں گا۔

رئیسہ کے خط کو آئے ابھی ایک ماہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ ایک دن میری بیوی نے مجھ سے ایک عجیب و غریب بات کہی۔ اس رات وہ ضرورت کے تحت صحن میں گئی تھی۔ ورنہ اندھیرا پھیلنے کے بعد وہ بیت الخلا کی طرف جانے سے گھبراتی تھی اور شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ بیت الخلا پرانے کنویں کے قریب صحن کے اختتام پر حد بندی کی چہار دیواری کے ساتھ واقع تھا۔ اس رات جب وہ باہر نکلی تو بڑے اچھے موڈ میں تھی لیکن جب ایک منٹ بعد ہی وہ دوبارہ بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تو میں نے اس کے چہرے پر مردنی کے اثرات دیکھے۔ وہ کسی بات سے بری طرح خوفزدہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اس کے علاوہ جس بوکھلاہٹ میں اس نے اندر داخل ہونے پر دروازے کو کنڈی لگائی اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی چیز سے دہشت زدہ ہو کر بھاگی ہے۔

"کیا بات ہے۔ یہ اتنی رات کو کیا بھاگ دوڑ لگا رکھی ہے تم نے" میں نے روکھے لہجے میں پوچھا۔

"وہ۔ وہ۔ باہر......" میری بیوی اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی اور خوفزدہ انداز میں قدم بڑھاتی میرے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کی دہشت زدہ نظریں بار بار بند دروازے کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ جیسے باہر کوئی چور یا ڈاکو موجود ہو جو اندر گھس کر اس کا گلا دبا دے گا۔

"کیا تھا باہر؟" میں نے اس بار قدرے نرمی سے دریافت کیا۔

"پتا نہیں۔" وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

"کچھ دیکھا تھا تم نے۔"

"جی ———— جی نہیں۔"

"پھر بات کیا ہے آخر۔" میں چڑ گیا۔

"وہ ———— وہ آواز۔" میری بیوی نے میری طرف دیکھ کر سہمے ہوئے انداز میں کہا۔ "میں نے اسے دیکھ نہیں تھا۔ بس آواز سنی تھی۔"

"آواز سنی تھی" میں چونک کر بولا۔ "کس کی تھی وہ آواز۔"

"کک ..... کوئی ...... عورت تھی" میری بیوی نے پھر خوفزدہ نظروں سے دروازے کی سمت دیکھا۔

"چلو میں دیکھتا ہوں۔" میں اٹھنے لگا تو وہ بے اختیار مجھ سے چمٹ گئی۔ "کیا مصیبت ہے" میں جھلا گیا۔

"خدا کے لئے آپ باہر نہ جائیں۔" وہ گڑگڑانے لگی۔

"حماقت کی بات مت کرو۔" میں نے بیوی کو سمجھایا پھر اٹھ کر ٹرنک سے اپنی ٹارچ نکالی اور باہر آگیا۔

وسیع و عریض صحن میں ہر طرف گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ جھینگر اور دوسرے حشرات الارض کی تیز آوازیں اس ویران اندھیرے میں بڑی پراسرار لگ رہی تھیں۔ میں نے دروازے پر رک کر ٹارچ روشن کی اور صحن کا جائزہ لینے لگا۔ ٹارچ کی تیز روشنی اندھیرے میں ادھر ادھر گھومتی رہی۔ خاصی دیر بعد جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ صحن میں اس وقت ہمارے سوا کوئی تیسرا شخص موجود نہیں ہے تو میں نے اپنی بیوی سے متوجہ ہو کر نرمی سے کہا۔

"وہم ہو گا تمہارا۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

"خدا کرے وہ میرا وہم ہی ہو۔" بیوی نے لمبی سانس لے کر جواب دیا پھر اس کنویں کی طرف دیکھنے لگی جس کے قریب بیت الخلا بنا ہوا تھا۔

"کس قسم کی تھی وہ آواز" میں نے کچھ سوچ کر پوچھا

"مجھے ایسا محسوس ہوا تھا ———— جیسے کوئی عورت بڑے کرب کی حالت سے دو چار ہو لیکن اس کا وہ جملہ۔" میری بیوی نے سہمی ہوئی آواز میں یہیں تک کہا تھا کہ میں حیرت سے اچھل پڑا۔

گھپ اندھیرے میں کسی عورت کے کھنکتے ہوئے قہقہے کی آواز اس وقت مجھے بڑی خوفناک لگی تھی۔ یوں لگا جیسے کسی برتن میں بہت سارے کنکر جمع کر کے انہیں زور سے ہلا دیا گیا ہو۔ ایک ثانئے تک میں خاموش کھڑا رہا پھر میں نے پرانے کنویں کی طرف جانے کا ارادہ کیا تھا کہ میری بیوی نے لپک کر میرا بازو تھام لیا۔

"خدا کے لئے۔ آپ اس طرف نہ جائیں۔"

"گھبراؤ نہیں۔" میں نے اپنی بیوی کو سمجھایا۔ "اگر وہ کوئی عورت ہے تو ہمیں اس سے خائف نہیں ہونا چاہئے۔"

"پھر بھی میری التجا ہے کہ آپ اس وقت رہنے دیں۔ صبح دیکھا جائے گا۔"

نہ جانے کیوں میں نے بیوی کی اس تجویز کو مان لیا اور اندر چلا گیا۔ دوسری صبح میں نے پرانے کنویں میں بھی جھانک کر دیکھا۔ لیکن وہاں جھاڑ جھنکار اور کوڑے کرکٹ کے سوا کچھ نظر نہ آیا ——— یہ سوچ کر کہ ممکن ہے وہ قہقہہ کسی پاگل عورت کا ہو میں نے اس واقعے کو کوئی اہمیت نہیں دی اور ناشتہ کر کے دفتر چلا گیا۔

اس حادثے کو ابھی آٹھ دس روز بھی نہ گزرے تھے کہ ایک رات میری بیوی سوتے سے چیخ مار کر جاگی پھر مجھ سے لپٹ کر خوفزدہ انداز میں یوں کانپنے لگی جیسے اس پر واقعی لرزہ طاری ہو۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے۔ آنکھوں سے دہشت جھانک رہی تھی اور رنگت ہلدی کی طرح زرد پڑی ہوئی تھی۔ اس بار بھی اس کی خوفزدہ نظریں بار بار دروازے کی سمت اٹھ رہی تھیں۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ اسے ڈانٹ ڈپٹ کر خود سے علیحدہ کر دوں مگر خیال آیا کہ ممکن ہے اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہو اور وہ چیخ کر بیدار ہو گئی۔ میں نے پہلے تکئے کے نیچے سے سگریٹ سلگائی پھر ایک طویل کش لے کر نرمی سے پوچھا۔

"کیا بات ہے۔ کیا تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔"

"خواب۔" اس نے مجھے گھور کر دیکھا پھر پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ "مجھ سے غلطی ہو گئی جو میں تنہا اٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔"

"باہر چلی گئی تھی ———؟" میں نے حیرت سے کہا اس لئے کہ جس وقت میری بیوی نے چیخ ماری تھی اس وقت میں ہوش و حواس میں تھا اور جاگ رہا تھا۔ میں نے خود اپنی نظروں سے اسے چیخ مار کر بیدار ہوتے بھی دیکھا تھا اس لئے اس کا جملہ میرے لئے حیران کن ثابت ہوا۔ بہر حال میں نے بڑے ضبط سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔ "تم نے ضرور کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔"

"تو کیا صحن میں نہیں گئی تھی۔"

"بالکل نہیں۔" میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بڑے یقین سے کہا۔

"پھر ——— پھر وہ آواز میرے کانوں تک کیسے پہنچی" میری بیوی نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا پھر دوبارہ مجھ سے لپٹ گئی۔

"کیا مصیبت ہے آخر۔" میں ایک دم جھلا کر بولا۔ "دور ہٹ کر کیوں نہیں بیٹھتیں۔ بھلا یہاں کون موجود ہے جو تم ڈر کے مارے مری جا رہی ہو۔"

میرا رویہ چونکہ اس وقت اس کو برا لگا۔ وہ جلدی سے مجھ سے علیحدہ ہو گئی اور مجھے یوں گھورنے لگی جیسے نگاہوں ہی نگاہوں میں مجھ سے شکایت کر رہی ہو۔ اس کے چہرے پر شدید بے کسی اور بوکھلاہٹ کے تاثرات نمایاں تھے۔

"تم آخر بتاتی کیوں نہیں کہ وہ آواز تم سے کیا کہتی ہے" میں نے تنگ آکر پوچھا۔

"جان دو مال لو۔" اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا اور پھر اپنا نچلا ہونٹ کاٹنے لگی۔

"بکواس ———" میں نے اسی فائل کو اٹھاتے ہوئے کہا جس کے مطالعے میں پہلے محو تھا۔ "جاؤ۔ سو جاؤ جا کر"

"جی اچھا۔" وہ بڑے ہی مایوس لہجے میں بولی پھر اٹھی لیکن دو قدم جانے کے بعد گھوم کر مجھے دیکھنے لگی۔

"اب کیا بات ہے۔" میں نے قدرے ترش آواز میں سوال کیا۔

"ایک بات کہوں اگر آپ غصہ نہ کریں۔"

"کہو۔"

"مجھے یہ مکان آسیب زدہ معلوم ہوتا ہے آپ کوئی دوسرا مکان لے لیجئے۔"

"تمہارا دماغ چل گیا ہے۔" چار سال سے ہم اسی مکان میں رہ رہے ہیں پھر یہ اچانک آسیب اور بھوت پریت کہاں سے آ گئے۔"

"کچھ بھی ہو۔ اب مجھے اس مکان سے ہول آنے لگا ہے۔"

" بڑے شوق سے ہولتی رہو مگر میں یہ مکان ہرگز تبدیل نہ کروں گا۔" میں نے فیصلہ کن جواب سنا دیا۔

"آپ کو میری بات کا یقین نہیں آیا شاید" وہ آہستہ سے بولی "یہاں یقیناً" کوئی بدروح یا چڑیل موجود ہے"

"پھر ------- میں کیا کر سکتا ہوں۔"

میری بیوی میرے اس تلخ و ترش رویے پر مجبوراً" مہربلب ہو گئی اور چپ چاپ اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئی۔ میں فائل کے مطالعے میں مصروف ہو گیا لیکن اس دوران جتنی بار بھی میں نے نظر گھما کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا اسے کسی گہری سوچ میں غرق پایا۔ وہ مستقل جاگ رہی تھی اور چھت کو گھورے جا رہی تھی۔ دو چار بار تو میں نے اس کی اس حرکت کو نظرانداز کر دیا۔ پھر جب اس کی تشویش پر غور کیا تو خود بھی الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ حیرت کی بات یہ تھی ہم دونوں کو اس مکان میں چار سال گزر چکے تھے لیکن اس عرصے میں میری بیوی نے پہلے کبھی اس قسم کی حرکتیں نہیں کی تھیں نہ ہی اس نے کبھی کسی بھوت یا چڑیل کا ڈھونگ رچانے کی کوشش کی تھی ------- پھر ------- اچانک یہ سب کچھ کیسے شروع ہو گیا؟ وہ پر اسرار آواز کس کی تھی جس نے میری بیوی کو اچانک اس قدر خوفزدہ کر دیا تھا جبکہ اس اللہ کی بندی نے آج تک نہ تو کبھی مجھ سے کسی چیز کی فرمائش کی تھی نہ ہی میرے خشک اور تلخ رویے پر کبھی اعتراض کیا تھا۔ وہ ایک مشرقی خدمت گزار بیوی کی طرح میری ہربات کو ہنس کر پی جانے کی عادی تھی۔ میری نفرت کے باوجود مجھ سے بے انتہا محبت کرتی تھی اور ہر طرح سے میرے آرام کا خیال رکھتی تھی۔ پھر اچانک اسے کسی بدروح یا چڑیل کا خیال کیسے آ گیا؟

رات بھر میں اسی خیال میں پریشان رہا۔ صبح میں نے کچھ جلدی کاموں سے فراغت پائی اور سیدھا مالک مکان کے پاس پہنچا۔ مالک مکان نے میری بات سنی تو اور برہم ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"میں نے آپ کو کوئی بھلا مانس جان کر مکان دیا تھا لیکن اب میں سمجھ رہا ہوں کہ آپ کی باتوں کا مقصد کیا ہے۔ غالباً" آپ میرے مکان کو آسیب زدہ بتا کر اس کا کرایہ کم کرنا چاہتے ہیں۔ بہر حال بھائی صاحب' میری درخواست ہے کہ مہربانی فرما کر آپ اپنا کوئی اور بندوبست کر لیں اور میرا مکان خالی کر دیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ایک ماہ کے اندر اندر تمہارا مکان چھوڑ دوں گا۔" میں نے بھی برہم ہو کر کہا اور دفتر چلا گیا۔

دفتر میں بھی رہ رہ کر مجھے اپنی بیوی کی باتوں کا خیال آ رہا تھا۔ اب مجھے ایک ماہ کے اندر کوئی دوسرا مکان لینے کی بھی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ دن بھر کسی نہ کسی طرح میں نے دفتر کے کاموں کو نپٹایا پھر چار بجے دفتر سے اٹھ گیا۔ دفتر سے میرے مکان کا فاصلہ دو فرلانگ تھا۔ اس لئے میں پیدل ہی آتا جاتا تھا۔ واپسی پر میں عموماً" ایک جنرل اسٹور سے جس کا مالک ایک ہندو پریتم لال تھا۔ روزانہ سگریٹ خریدا کرتا تھا۔ پریتم لال کے باقی خاندان والے ہندوستان جا چکے تھے لیکن اس نے قصور میں اپنی زندگی کے ساٹھ سال گزارے تھے اس لئے اس جگہ سے محبت ہو گئی تھی۔ شاید اس خیال سے بھی اس نے پاکستان کو نہیں چھوڑا تھا کہ مسلمان کسی بوڑھے پروار نہیں کریں گے۔ میں نے بھی ان چار سالوں میں یہی اندازہ لگایا تھا کہ علاقے کا ہر بوڑھا اور جوان پریتم لال سے بہت زیادہ مانوس تھا۔ خود پریتم لال بھی بے حد ملنسار خوش اخلاق اور نیک طبیعت واقع ہوا تھا۔ آدھی رات کو بھی اگر کسی کو پریتم لال سے کوئی کام پیش آ جاتا تو وہ ضرورت مند کی خدمت میں پیش پیش رہتا تھا۔ غرضیکہ میں نے روزمرہ کے معمول کے مطابق پریتم لال کے اسٹور سے سگریٹ خریدی۔ اور اس سے کسی سستے مکان کے بارے میں نظر دوڑانے کو کہا۔

"میں تمہارے لئے دوسرا مکان تلاش کرنے کو تیار ہوں بھیا۔ پر جس مکان میں تم رہتے ہو وہ بھی کچھ اتنا برا نہیں ہے۔"

"برا تو نہیں ہے لیکن بات کچھ ایسی ہی ہو گئی ہے۔" میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"کیوں۔ کوئی خاص بات ہو گئی ہے کیا۔"

"ہاں۔" میں نے مختصراً" جواب دیا۔

"میں پریتم لال کو پورا قصہ سنانا نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے اوپر ہنسے گا۔ لیکن جب اس نے اصرار کیا تو میں نے اسے تمام واقعات بتا دیئے۔ پریتم لال بڑے غور سے میری باتوں کو سنتا رہا۔ پھر کچھ خاموش رہنے کے بعد راز داری سے بولا۔

"بھیا۔ میری مانو تو تم اس آواز کا کھوج لگانے کی کوشش کرو۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پریتم لال کے چہرے پر سنجیدگی دیکھی تو مجھے شبہ ہوا کہیں وہ بوڑھا ہندو میرا مذاق تو نہیں اڑا رہا۔"

"ناراض مت ہو بھیا۔" پریتم لال جلدی سے بولا۔ "میں نے تمہیں جو مشورہ دیا ہے وہ تمہارے لئے فائدہ مند ہو گا۔ اگر لکشمی تم پر مہربان ہو گئی تو وارے نیارے ہو جائیں گے تمہارے۔"

"لکشمی۔ میں سمجھا نہیں۔" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"لکشمی مایا کی دیوی کو کہتے ہیں بھیا۔" پریتم لال نے مجھے سمجھاتے ہوئے جواب دیا۔ جس پر لکشمی مہربان ہو جائے اس کے دن پھر جاتے ہیں۔ وہ سدا سونے چاندی میں کھیلتا ہے۔ ممکن ہے کہ لکشمی کو تمہاری غربت پر رحم آگیا ہو اور وہ تمہیں کوئی بڑا دھن دان کر دے۔"

"دھن اور سونا چاندی۔" میں بے اختیار ہنس پڑا "کیوں میری غربت کا مذاق اڑاتے ہو بھیا۔"

"بھگوان کی سوگند بھیا۔ میں تمہارا مذاق نہیں اڑا رہا۔" پریتم لال نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "لکشمی کے بارے میں جو کچھ تمہیں بتایا ہے وہ غلط نہیں ہے۔ پر ایک بات اور بتادوں۔ اگر وہ لکشمی ہی ثابت ہوئی تو تمہیں دھن حاصل کرنے کے لئے ایک جیون اس کی بھینٹ چڑھانا ہو گا۔ اس کے بغیر وہ تمہیں دھن دولت کا پتا کبھی نہ بتائے گی۔"

"مجھے ان باتوں پر کبھی بھی اعتماد نہیں آ سکتا۔ یہ سب ضعیف الا اعتقادی کی باتیں ہیں۔" میں نے پریتم لال کو گھورتے ہوئے کہا پھر واپس گھر چلا آیا۔

اس روز رات بے حد گرم تھی چنانچہ میں نے کمرے کے بجائے اپنا پلنگ باہر صحن میں برآمدے کے ساتھ ہی ڈال لیا۔ میری بیوی نے مجھے منع کیا تھا کہ میں صحن میں نہ سوؤں' پر میں نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر اس غریب نے بھی مجبورا" اپنا پلنگ باہر نکال لیا اور خاموشی سے سونے کے لئے لیٹ گئی۔ مجھے خیال نہیں کہ وہ لیٹتے ہی سو گئی یا جاگ رہی تھی لیکن گرمی کی وجہ سے مجھے نیند ہی نہیں آ

رہی تھی۔ کچھ دیر تک میں سونے کی خاطر ادھر ادھر کروٹیں بدلتا رہا۔ لیکن نیند نے تو جیسے نہ آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں پیشاب کرنے کی غرض سے اٹھا اور بیت الخلا کی طرف چل دیا۔ اس وقت میرے ذہن میں بیوی کی کہی ہوئی باتوں کا خیال تھا اور نہ ہی پریتم لال کی۔ میں نے بیت الخلا میں جاکر پیشاب کیا اور باہر آگیا لیکن واپسی پر کنویں کے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے چونک کر رک جانا پڑا۔ میں نے کسی عورت کے قہقہے کی آواز واضح طور پر سنی تھی اب وہ آواز کچھ گھٹی گھٹی سی تھی۔ ابھی میں یہ فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ آواز کس طرف سے آئی ہے کہ میرے کانوں میں ایک اور آواز گونج گئی۔

"جان دو مایا لو۔"

اس بار میں نے تیزی سے اپنا رخ کنویں کی سمت کر لیا۔ آواز یقینا" اسی کنویں کے اندر سے آئی تھی۔

"کون ہے؟" میں نے اونچی آواز میں پوچھا۔

"جان دو ——— مایا لو۔" میرے سوال کے جواب میں پھر وہی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ایک لمحے کیلئے مجھے خیال گزرا کہ آگے بڑھ کر کنویں میں جھانک کر دیکھوں اور معلوم کروں کہ یہ کیا اسرار ہے لیکن دوسرے ہی لمحے پریتم لال کی بتائی ہوئی باتوں نے مجھے چونکا دیا مجھے اس قسم کی فرسودہ باتوں پر بالکل اعتقاد نہ تھا لیکن اس وقت نہ جانے کیوں میرے دل نے کہا کہ آزما کر دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ میں نے دل کو مضبوط کر کے آہستہ سے کہا۔

"لکشمی۔ میں تمہارے اوپر بھینٹ چڑھانے کو تیار ہوں۔"

یہ کہہ کر میں لمبے لمبے قدم اٹھاتا اپنے بستر کے قریب آگیا۔ برابر ہی میری بیوی بے خبر سو رہی تھی۔ اس غریب کے چہرے پر اس وقت بڑا اطمینان نظر آ رہا تھا میں کچھ دیر تک خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر سوچ کر تیزی سے اندر کمرے میں آیا۔ ایک کاغذ کے بیکار سے ٹکڑے کو لپیٹ کر تعویذ کی شکل دی پھر اپنی بیوی کے پرانے دوپٹے کا ایک کونا پھاڑ کر کاغذ کے ٹکڑے کو اس میں اسطرح باندھا جیسے امام ضامن بنایا جاتا ہے۔ پھر میں باہر آیا اور اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ میری معصوم اور بے گناہ بیوی

بدستور محو خواب تھی۔ میں اسے چند لمحے دیکھتا رہا پھر دھڑکتے ہوئے دل سے اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے بازو سے تھام کر ہلانا شروع کر دیا۔

"کون ——— کون ہے۔" وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"گھبراؤ نہیں۔ میں ہوں" میں نے آہستہ سے کہا۔

"خیریت تو ہے" وہ مجھے دیکھ کر بولی۔

"پریشان مت ہو سب خیریت ہے۔" میں نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا پھر اس بناوٹی تعویذ کو بیوی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اسے جا کر پرانے کنویں میں ڈال دو۔"

"یہ کیا ہے؟" میری بیوی نے تعجب سے پوچھا۔

"تعویذ۔" میں نے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔ "تم نے اس مکان میں آسیب اور چڑیل کا خطرہ محسوس کیا تھا نا۔ اس لئے میں یہاں کے ایک شاہ صاحب سے یہ تعویذ لایا ہوں۔ انہوں نے کہا تھا کہ اسے آدھی رات گئے اگر پرانے کنویں میں ڈال دیا جائے تو پھر کسی قسم کا خطرہ باقی نہ رہے گا۔"

"مجھے ادھر جاتے ہوئے ہول آتا ہے۔ آپ خود ہی جا کر تعویذ ڈال دیجئے۔" میری بیوی نے سہمی ہوئی نظروں سے پرانے کنویں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"شاہ صاحب کا حکم ہے کہ اسے کوئی عورت ہی کنویں میں ڈالے" میں نے جلدی سے کہا "گھبراؤ نہیں میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

میری بیوی یہ سن کر تیار ہو گئی۔ ہم دونوں پرانے کنویں کی طرف بڑھنے لگے۔ جیسے جیسے فاصلہ کم ہوتا جاتا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جاتی تھیں۔ جب کنویں کا فاصلہ کوئی تیس فٹ رہ گیا تو میں رک گیا۔

"کیوں۔ آپ رک کیوں گئے۔" میری بیوی نے پوچھا۔

"میں شاہ صاحب کے حکم کے مطابق تعویذ ڈالتے وقت تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ تم اب جلدی سے آگے بڑھ کر تعویذ کنویں میں ڈال دو۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

میری بیوی نے بڑی معصوم نظروں سے میری طرف دیکھا پھر تعویذ ہاتھ میں لئے آگے بڑھ گئی۔ میں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔ کنویں کے قریب جا کر اس نے اپنا سر نیچے جھکایا پھر تعویذ والا ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ ایک کربناک چیخ فضا میں گونج کر معدوم ہوتی چلی گئی۔ نہ جانے وہ کون سی قوت تھی جس نے اس غریب عورت کو اٹھا کر کنویں کے اندر جھونک دیا تھا۔ میں سکتے کی کیفیت سے دو چار کھڑا تھا۔ میرا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ جو کچھ میری نظروں نے دیکھا اس پر یقین نہیں آتا تھا۔ کنویں کی جگت چار فٹ سے کسی طرح کم نہ تھی اس لئے میری بیوی کا اچانک اچھل کر اس میں جا پڑنا میرے لئے انتہائی تعجب خیز بات تھی۔

ابھی میں کسی بت کی طرح گنگ کھڑا اس حادثے پر ششدر تھا کہ اچانک مجھے اس واقعے کی سنگینی کا خیال آیا۔ میرے ضمیر نے مجھے ملامت کی۔ میں کنویں کی طرف بے تحاشا بھاگا۔ میں نے اس اندھیرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں گہرا اندھیرا طاری تھا۔ اور مکمل سکون تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ "یہ سب کیا ہو گیا۔" میں ہاتھ ملتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ "یہ کیا ہو گیا۔"

میں بھاگا بھاگا اندر گیا اور ٹارچ لے کر پھر کنویں کے پاس آ گیا۔ میری حالت اس وقت پاگلوں جیسی تھی۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ٹارچ کی روشنی جب میں نے کنویں میں ڈالی تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی میں میری بیوی کا کنویں میں کہیں پتا نہ تھا۔ البتہ نظروں کو خیرہ کر دینے والے زرد جواہر ٹارچ کی روشنی میں سارے کنویں کو بقعہ نور بنائے ہوئے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے ایک کالی سی دیگ نظر آئی جس میں سونا ہی سونا تھا۔ سونے کے اس ذخیرے کو دیکھ کر میرے حواس جاتے رہے۔ میری سمجھ میں ساری بات آ گئی۔ لکشمی نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔ میں چارپائیوں کی رسیاں کھول کر رات بھر کنویں سے سونا نکالتا رہا۔ پسینے سے میرا برا حال تھا۔ رسیوں سے میرے ہاتھ چھل گئے تھے۔ صبح ہونے سے پہلے میں پوری دیگ خالی کر چکا تھا۔ اتنا بڑا خزانہ دیکھ کر مجھے اپنی بیوی کے سانحے کا کوئی ملال نہ تھا۔ اس وقت تو مجھے ایک ہی دھن سوار تھی کہ جلد سے جلد کنویں سے سارا دھن نکال لیا جائے۔

پریتم لال نے لکشمی کے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا تھا وہ حرف بحرف ٹھیک ثابت ہوا۔ لکشمی نے مجھے میری بیوی کی جان کے عوض کروڑوں کے زر و جواہر اور سونے کی اشرفیاں بخش دی تھیں۔ جنہیں میں نے کسی ندیدے انسان کی طرح جلدی جلدی سمیٹ کر راتوں رات صندوق میں محفوظ کر دیا تھا۔ بیوی کی پر اسرار موت سے زیادہ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ اب میرے سارے دکھ دور ہو جائیں گے اور میں اپنی رئیسہ کو بھی اپنا لوں گا۔ اگر کوئی فکر تھی تو بس اس بات کی تھی کہ بیوی کی لاش کہیں کنویں سے بر آمد نہ ہو جائے۔ میں ساری رات اسی ادھیڑبن میں رہا۔ لیکن جب صبح نمودار ہوئی اور میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے کنویں میں جھانکا تو وہاں سوائے جھاڑ جھنکار اور کوڑے کرکٹ کے مجھے اور کچھ بھی نظر نہ آسکا۔ وہاں دیگ بھی نہ تھی یہ سوچ کر میری ساری الجھن ختم ہو گئی کہ لکشمی نے میری بیوی کی ہڈیوں تک کو غالباً" سرمہ بنا کر استعمال کر لیا تھا۔ اب میرے لئے بس ایک ہی مسئلہ باقی رہ گیا تھا کہ میں جلد از جلد رئیسہ کو تلاش کروں اور اسے ساتھ لے کر کسی بڑے شہر کی طرف نکل جاؤں۔ جہاں تک میری بیوی کی موت کا تعلق تھا تو اس سلسلے میں کوئی مجھ سے باز پرس کرنے والا نہیں تھا۔ اس کے والدین پہلے ہی مر چکے تھے جس کی وجہ سے میرے والد نے ترس کھا کر اسے میرے سر تھوپ دیا تھا۔ بیوی کے قریب عزیزوں میں سے صرف ایک ماموں تھے۔ جنہوں نے اس کی شادی کے اخراجات بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کئے تھے لیکن بٹوارے کے فساد کے وقت وہ لا پتہ ہو گئے تھے۔ قصور میں میری بیوی کا پاس پڑوس والوں سے بھی کچھ زیادہ میل جول نہیں تھا۔ بس یہ کہ میرے لئے کوئی خاص دشواری نہیں تھی۔

میں حسب معمول دوسری صبح دفتر گیا۔ اور دفتر کا کام کرتا رہا۔ رات جو عجیب واقعہ پیش آیا تھا۔ کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہ تھی۔ چار روز تک میں نے اپنے معمول میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ پانچویں دن میں نے اپنے پڑوسیوں میں یہ مشہور کر دیا کہ میری بیوی اپنے عزیزدار کے پاس کراچی چلی گئی ہے اور اب میں بھی کراچی جا کر ملازمت کا خیال رکھتا ہوں۔ دفتر میں بھی میں نے یہی کہا اور ملازمت سے مستعفی ہونے کے لئے پندرہ روز کا نوٹس دے دیا۔

اگر میں چاہتا تو فوری طور پر بھی ملازمت چھوڑ سکتا تھا جس کے لئے مجھے پندرہ روز کی تنخواہ گنوانی پڑتی لیکن اس طرح ممکن تھا کہ دفتر والوں کو شبہ ہو جاتا دوسری بات یہ تھی کہ میں اس عرصے میں رئیسہ کو ڈھونڈ نکالنے کے بارے میں بھی غور کر رہا تھا اس لئے کہ جو کچھ میں نے کیا تھا۔ اس میں رئیسہ کا قرب بنیادی حیثیت رکھتا تھا۔

آٹھ نو روز اسی پریشانی میں گزر گئے۔ میں چونکہ استعفیٰ دے چکا تھا اور نوٹس کی مدت پوری کر رہا تھا اس لئے میں نے دفتری کاموں میں اب زیادہ دلچسپی لینی چھوڑ دی تھی۔ اب میرا معمول تھا کہ میں صبح تو ٹھیک وقت پر آفس پہنچتا پھر ایک دو گھنٹے بیٹھ کر کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اٹھ جاتا اور پھر سارا دن رئیسہ کی تلاش میں ادھر ادھر مارا مارا پھرتا۔ جوں جوں میرے استعفیٰ کی مدت نزدیک آتی جاتی تھی میرا اضطراب بڑھتا جاتا تھا اس لئے بھی کہ ابھی تک رئیسہ مجھے نہیں مل سکی تھی اور اس لئے بھی کہ مجھے ہر وقت یہی کھٹکا لگا رہتا تھا کہ وہ رقم جس کا تخمینہ میں نے کروڑوں میں لگایا تھا۔ اور جسے میں نے اپنی بیوی کو لکشمی کی بھینٹ چڑھا کر حاصل کیا تھا۔ چوری نہ ہو جائے۔

باہواں دن گزرا تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب اگر رئیسہ نہ بھی ملی تو میں قصور سے چلا جاؤں گا تاکہ جلد از جلد اپنے آپ کو زندگی کے اس حسین سانچے میں ڈھال لوں جس کی مجھے بچپن سے آرزو تھی۔ رئیسہ کو بعد میں بھی تلاش کیا جا سکتا تھا۔ تیرھویں دن میں دفتر سے اٹھ کر اسٹیشن کی طرف یونہی چہل قدمی کرتا جا رہا تھا کہ اچانک ایک کار میرے قریب آکر رکی ———— مجھے ڈرائیور کی یہ حرکت بہت بری لگی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے کار کے اندر سمٹی ہوئی رئیسہ نظر آئی۔ اس وقت مجھے اتنی ہی خوشی ہوئی جتنی پہلی بار لکشمی کے دھن کو دیکھ کر ہوئی تھی۔

"رئیسہ۔ تم۔" میں تیزی سے لپک کر اس کے قریب جاتا ہوا بولا۔

"میں نے سنا ہے کہ تم قصور کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر کہیں اور جا رہے ہو' رئیسہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ میرا ارادہ ہے کہ اب لاہور جا کر تجارت کروں گا۔""

"کیا واقعی۔ مگر لاہور میں تم کہاں ٹھہرو گے۔"

"ظاہر ہے ہوٹل میں' میں نے اداسی سے جواب دیا پھر میں نے کہا۔ "کیا تم جانتی ہو میں نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے۔" جب سے تمہارا خط ملا ہے میں تمہارے لئے ہی سوچتا رہا ہوں۔ تمہارے بغیر اب زندگی اجیرن معلوم ہوتی ہے۔"

"اگر تم میرا اتنا ہی خیال ہوتا تو آج ہم اجنبیوں کی طرح اور چوری چھپے کیوں ملتے۔"

"جو کچھ ہونا تھا ہو چکا رئیسہ' اب ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔ بولو کیا تم میرے ساتھ شادی کرنے پر تیار ہو۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" رئیسہ چونک کر بولی۔ "کیا تمہارا خیال ہے کہ میں اپنی خوشی کے لئے کسی دوسری عورت کی زندگی کی مسرتیں چھین لینا پسند کرلوں گی۔"

"تمہیں حالات کا علم نہیں ہے شائد" میں نے اسی دلگیر لہجے میں کہا۔ "تم جس عورت کا ذکر کر رہی ہو وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔"

"کہاں۔"

"جہاں وہ خوش رہ سکتی تھی۔" میں نے جزبز ہوتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس کے راستے میں رکاوٹ بننے کی کوشش نہیں بلکہ اسے آزاد کر دیا۔"

"کیا تم نے اسے طلاق دے دی۔" رئیسہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ یہی اس کی خواہش تھی۔"

"مگر میں نے تو سنا تھا کہ وہ اپنے کسی عزیز کے پاس کراچی گئی ہے۔"

"میں نے یہی مشہور کر دیا اور اب اسی لئے میں خود بھی یہاں سے کہیں دور چلا جانا چاہتا ہوں تاکہ لوگ میرا مذاق نہ اڑا سکیں۔"

رئیسہ کچھ دیر تک کار میں بیٹھی مجھ سے باتیں کرتی رہی اس کے بعد مجھے تفصیل سے بتایا کہ وہ لاہور میں رہتی ہے اور وہیں ایک فلاحی ادارے سے متعلق ہے۔ جس کے لئے اس کا قصور اور دوسرے شہروں میں آنا جانا رہتا ہے۔ رئیسہ نے بتایا کہ اس کے ماں باپ اب معذور سے ہو گئے ہیں والدہ اور والد کی کفالت وہ خود کرتی ہے ہم دونوں نے اپنی آئندہ زندگی کے متعلق بہت سنجیدگی سے گفتگو کی۔ اس نے مجھے لاہور

کا اپنا پتا دیا اور ہدایت کی میں لاہور آ کر اس کے والدین سے فوراً مل لوں وہ مسرت میں ڈوبی ہوئی یہ وعدہ کر کے چلی گئی کہ اب لاہور میں مجھے ملے گی۔ باتوں باتوں میں اس کو یہ بھی بتا دیا کہ اب میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میں کوئی ذاتی کاروبار شروع کر سکوں۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ پاکستان آتے وقت میں نے اپنا مکان فروخت کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی جھوٹ بولا کہ روانگی سے قبل میرے دادا نے بھی میرے والد کے حصے کے آٹھ لاکھ مجھے دیئے تھے جو میں نے بعد میں پاکستان منگا لئے اور اب انہی روپوں سے اپنا کاروبار شروع کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ رئیسہ میری باتوں سے پوری طرح مطمئن تھی۔"

طے شدہ پروگرام کے تحت ———— تیسرے دن خاموشی سے میں قصور سے رخصت ہو گیا اور لاہور چلا آیا۔ اور ایک اچھے سے ہوٹل میں قیام کیا۔ لاہور آنے کے پندرہ دن کے اندر اندر میں نے ان تمام زرو جواہر کو نقدی میں تبدیل کرا کے مختلف بینکوں میں محفوظ کر لیا جو مجھے لکشمی نے دئے تھے۔ اسی اثنا میں' میں نے اچھرہ کے علاقے میں ایک واجبی سا مکان کرائے پر لے لیا اور رئیسہ کے والدین سے مل کر رشتے کی درخواست کی۔ قصہ مختصر کہ جلد ہی میری شادی رئیسہ سے ہو گئی میں رئیسہ کو اور رئیسہ مجھے پا لینے کے بعد خود کو دنیا کے سب سے خوش قسمت انسان تصور کر رہے تھے۔ رئیسہ نے ملازمت چھوڑ دی تھی۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے میری قسمت کا پانسہ بھی پلٹتا رہا۔ میں نے بھاگ دوڑ کر دلالوں کے ذریعے ایک زمین کا سودا کیا اور وہاں اپنا ذاتی کارخانہ تعمیر کرانے لگا۔ اسی دوران میں نے شہر کے ایک پر سکون علاقے میں اپنے نئے مکان کی نیو بھی ڈال دی اور صبح سے شام تک ان دونوں تعمیری منصوبوں میں لگا رہا۔ چھ ماہ بعد رئیسہ کو لے کر نئے مکان میں منتقل ہو گیا جہاں آرام و آسائش کی ہر شے مہیا تھی۔ نوکر چاکر اور گاڑیاں سبھی کچھ موجود تھا۔

میرا ذاتی کارخانہ مکمل ہوا تو میں نے لاہور کے ایک مشہور صنعت کار سے اس کی افتتاحی رسم ادا کرائی اور اپنا کام شروع کر دیا۔ اب میں ایک کروڑ پتی آدمی بن چکا تھا۔ میرے کارخانے میں بے شمار آدمی میرے ایک اشارے کے منتظر رہتے تھے' اور

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ رئیسہ میری زندگی' بھی میرے ساتھ تھی جو اب ایک لڑکے کی ماں بن چکی تھی۔

یہ سب کچھ میری خواہشوں سے زیادہ تھا۔ میں اپنی سابقہ بیوی کو یکسر فراموش کر چکا تھا' اور زندگی کے نئے ہنگاموں میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ مجھے آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔ جب رئیسہ نے مجھ سے فرمائش کی تھی کہ وہ اپنے لڑکے کی پہلی سالگرہ بڑے دھوم دھام سے منانا چاہتی ہے۔ میں نے اس تقریب کیلئے بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔

میرے لڑکے کی سالگرہ میں صرف ایک دن رہ گیا تھا۔ اس روز میں اور رئیسہ تمام دن خریداری اور اپنے بنگلے کے اس ہال کو سجانے میں مصروف رہے جس میں سالگرہ منائی جانے والی تھی۔ رات گئے تک بنگلے میں خوشی طاری رہی' پھر میں نے ملازموں کو آنے والی کل کے بارے میں ضروری ہدایات دیں اور خواب گاہ میں آ کر لیٹ گیا۔ دن بھر کا تھکا ہوا تھا اس لئے جلد ہی آنکھ لگ گئی۔ لیکن ابھی مجھے سوئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ایک دہشت ناک خواب دیکھ کر بیدار ہو گیا۔

میں اس رات اپنی پہلی بیوی کو پہلی بار خواب میں دیکھا تھا وہ مجھ سے بے حد شاکی نظر آتی تھی۔ اس کے چہرے پر مجھے غیر معمولی سنجیدگی اور اداسی نظر آئی۔ اس نے میرے بیڈ روم میں میرے قریب آ کر کہا۔

"آپ نے جو کچھ کیا اچھا نہیں کیا۔ اگر آپ نے مجھے پہلے بتا دیا ہوتا کہ میری زندگی کی بھینٹ آپ کے لئے خوشیاں فراہم کر سکتی ہے تو میں بخوشی آپ پر سے قربان ہو جاتی لیکن آپ نے مجھے آزمانے کی کوشش نہیں کی۔ میں تو خیر لکشمی کی بھینٹ چڑھ گئی لیکن آپ اس سودے پر خوش نہ رہ سکیں گے۔"

"تم ——— تم یہاں کیوں آئی ہو؟" میں نے خواب میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔"

"میرا آنا بھی ناگوار گزرا ہے۔" میری سابقہ بیوی نے اداس ہو کر کہا۔ پھر جاتے ہوئے بولی۔ "اگر آپ ناراض ہو رہے ہیں تو میں واپس جا رہی ہوں لیکن جاتے جاتے میں آپ کو لکشمی کا وہ پیغام پہنچا دوں جس کے لئے مجھے بھیجا گیا ہے۔"

"لکشمی کا پیغام!" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں لکشمی کا پیغام ——— اس نے آپ سے یہی کہلوایا ہے کہ اسے آپ کا لڑکا بہت اچھا لگتا ہے۔" میری مرحوم بیوی نے معنی خیز لہجے میں کہا پھر وہ فوراً میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اس خواب کا ختم ہونا تھا کہ میں ہڑبڑا کر اٹھا بیٹھا۔ خواب گاہ میں ہلکے نیلے رنگ کا بلب ابھی تک روشن تھا۔ میں نے رئیسہ کی طرف دیکھا جو اپنے بستر پر بڑے آرام سے محو خواب تھی۔ اس کے بائیں جانب میرا لڑکا سو رہا تھا۔ جس کی سالگرہ کل ہونے والی تھی' میں تھوڑی دیر ان دونوں کو دیکھتا رہا۔ پھر دوبارہ سونے کے لئے لیٹ گیا اور میں نے اپنے دل کو تسلی دی کہ جو کچھ میں نے خواب میں دیکھا وہ محض میرے تھکے ہوئے اعصاب کے سبب ہے۔

دوسری صبح میں اور رئیسہ دونوں ہی جلدی سو کر اٹھے' اور ضروریات سے فراغت پا کر سالگرہ کے ہنگاموں میں الجھ گئے ملازمین انتظامات کے سلسلے میں ادھر ادھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ رئیسہ انھیں ہدایات کرتی جاتی اور ایک ایک چیز کو اپنی نگرانی میں ٹھیک کرا رہی تھی۔

شام کو چھ بجے سے مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔ میرا بنگلا جگمگا رہا تھا' رنگ برنگے برقی قمقمے دلہن کی مانگ کی افشاں کی طرح دمک رہے تھے۔ رئیسہ اور میں مہمانوں کا گرمجوشی سے استقبال کر رہے تھے۔ آج میں نے بچے کی سالگرہ کی خوشی میں کارخانے میں چھٹی کر دی تھی اور تمام ملازمین کو ایک روز کی تنخواہ دینے کا اعلان کیا تھا۔

ساڑھے سات بجے تک تمام مہمان آ گئے۔ میں اور رئیسہ بھی بڑے ہال میں موجود تھے۔ ہر شخص مسرور نظر آ رہا تھا ہر طرف قہقہے ابل رہے تھے۔ میرا لڑکا اس بارات کا دولہا بنا ہوا تھا' کبھی وہ ایک مہمان خاتون کی گود میں نظر آتا تو کبھی دوسری کی۔

آٹھ بجے سارے مہمان اس بڑی میز کے گرد جمع ہو گئے جہاں انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے اور ایک طرف کنارے پر سالگرہ کا کیک رکھا ہوا تھا۔ رئیسہ

نے اپنے بچے کو گود میں لے رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں چھری تھما رہی تھی جس سے بچے کو کیک کاٹنا تھا۔ بچے کے ہاتھ میں چھری دے کر رئیسہ نے اوپر سے اس کا ہاتھ دبا لیا تا کہ چھری نکل نہ پائے پھر اس نے جھک کر کیک پر جلتی ہوئی موم بتی پر پھونک ماری بچے کا ہاتھ تھام کر کیک کٹوایا تو پورا ہال مبارک سلامت کے شور سے گونج اٹھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے خوشی کی محفل ماتم کدہ بن گئی۔

کیک کاٹے جانے کے بعد مہمان کھانے میں مشغول تھے کہ میرے بچے نے جو اس وقت میری ہی گود میں تھا۔ ایک خوفناک چیخ ماری پھر قبل اس کے میں کچھ کر سکتا اس نے خون کی قے کرنی شروع کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے میری گود میں اکڑ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ مہمانوں میں کہرام مچ گیا۔ رئیسہ پر دیوانگی طاری ہو گئی۔ اس نے اپنے جگر گوشے کو مجھ سے چھین کر اپنے سینے سے لپٹا لیا اور بین کرنے لگی میں پتھر کے کسی بت کی طرح یہ سب کچھ دیکھتا رہ گیا۔

اکلوتے لڑکے کی موت نے رئیسہ کے ذہن پر ایسا اثر کیا کہ وہ ہر وقت دیوانوں جیسی باتیں کرتی رہتی۔ میں نے شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹروں اور بہترین نرسوں کو اس پر معمور کر دیا تھا جو ہر وقت اس کی دیکھ بھال کرتے رہتے۔ خود میں بھی ہمہ تن مصروف رہتا اور دعائیں مانگتا رہتا کہ خدا کرے میری رئیسہ تندرست ہو جائے۔

تقریباً" تین ماہ تک رئیسہ اپنے بچے کی جدائی کے جان لیوا کرب میں بستر سے لگی رہی پھر رفتہ رفتہ اس کی ذہنی حالت اعتدال پر آنے لگی۔ ڈاکٹروں نے مجھے خوشخبری سنائی کہ اب وہ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ چار مہینے بعد رئیسہ بڑی حد تک اپنے بچے کی موت کا غم بھول گئی تھی اور اب وہ دوبارہ زندگی کے ہنگاموں میں حصہ لینے لگی تھی۔ جس روز اس نے غسل صحت کیا اس روز میں نے دل کھول کر غربا اور مسکینوں میں خیرات تقسیم کی۔

ادھر میرا کاروبار دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔ میرا رئیسہ کی بیماری کے دوران میں اپنے کارخانے سے وقتی طور پر قطع تعلق سا ہو گیا تھا لیکن میرا مینجر کمال ہوشیاری سے ہر کام کی دیکھ بھال کرتا رہا تھا۔ رئیسہ بھی اب رتی رتی معاملات میں دلچسپی لیتی تھی۔ اب میں نے ایک دوسرے شہر میں ایک اور چلتی ہوئی مل خرید لی تھی

اور کچھ ایسا ہو گیا تھا کہ جس کام میں میں ہاتھ ڈالتا وہ سونا بن جاتا۔ کاروبار سے فائدہ کم از کم یہ ہے کہ اس میں مصروفیت اور ہنگامے بہت رہتے ہیں ——— اور اسی لئے غالباً" کاروباری آدمی اپنے نجی دکھ درد کو جلد بھلانے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن بعض غم ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا زخم ہمیشہ تازہ رہتا ہے۔

مجھے خوشی تھی کہ رئیسہ اب اپنے بچے کے غم کو بھلا کر میرے کاروبار میں میرے شانہ بشانہ دلچسپی لے رہی ہے لیکن میری یہ خوشی بہت مختصر ثابت ہوئی۔ ایک روز میں لائل پور کے دورے سے واپس لوٹا تو میں نے رئیسہ کے چہرے پر غم کی پرچھائیں دیکھیں۔

"کیا بات ہے رئیسہ؟ تم کچھ اداس نظر آ رہی ہو ———" میں نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی تو میں نے ازراہ مذاق کہا۔

"سمجھ گیا ——— تم غالباً" زیادہ دنوں تک میری دوری نہیں برداشت کر سکتیں! ...... چلو وعدہ رہا کہ اب جب بھی کہیں باہر جاؤں گا تمہیں بھی اپنے ہمراہ لے جاؤں گا۔"

رئیسہ مسکرائی پھر فوراً" ہی اداس ہو کر بولی۔ "لیکن آپ جو سمجھ رہے ہیں وہ بات نہیں ہے۔"

"پھر کیا بات ہے؟" میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے محبت سے پوچھا۔

"منا اگر زندہ ہوتا تو کل ہم اس کی دوسری سالگرہ مناتے۔"

"ہاں ——— رئیسہ۔" میں سرد آہیں بھرنے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔

کچھ دیر تک میں رئیسہ کے پاس بیٹھا اسے سمجھاتا بجھاتا رہا پھر گھمانے کے لئے باہر لے گیا۔ دن بھر میں اسے ساتھ لئے ادھر ادھر کی تفریح کرتا رہا۔ دونوں وقت کا کھانا بھی اس روز ہم دونوں نے ہوٹل میں کھایا۔ پھر میں نے دوسرا شو دیکھنے کا پروگرام بنایا اور رئیسہ کو لے کر ایک انگریزی فلم دیکھنے چلا گیا ہماری واپسی کوئی ساڑھے بارہ بجے ہوئی۔ رئیسہ کا غم اس قدر ہلکا ضرور ہوا تھا کہ واپسی کے وقت اس

کے چہرے پر اضمحلال نہیں تھا ——— جسے دیکھ کر میں پریشان ہو گیا تھا۔

بہرحال گھر آکر ہم نے کپڑے تبدیل کئے اور اپنی خوابگاہ میں آ گئے' مجھ پر سفر کی تھکان بھی تھی لیکن اس کے باوجود میں اس وقت تک جاگتا رہا جب تک رئیسہ سو نہیں گئی۔ رئیسہ کے سونے کے بعد میں بھی دوسری طرف کروٹ لے کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ میری آنکھ بھی جلدی لگ گئی۔ میرا اندازہ ہے کہ شاید میں مشکل سے ایک ہی گھنٹے سویا ہوں گا کہ مجھے دوبارہ جاگنا پڑا۔ رئیسہ نے مجھے بیدار کیا تھا۔

"کیوں ——— کیا نیند نہیں آ رہی ———" میں نے اس کی طرف گھوم کر بڑے پیار سے پوچھا۔

رئیسہ کے چہرے پر اس وقت پھر ویسی ہی کیفیت طاری تھی جیسی میں صبح دیکھ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ویرانی برس رہی تھی اور وہ یوں مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی بہت دکھ کی بات کہنے والی ہو۔

"تم اس وقت پر پریشان نظر آ رہی ہو رئیسہ!" میں نے اسے سمجھایا۔ "موت اور زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے' ہمارا ان پر کوئی اختیار نہیں جو کچھ ہوا ہے اسے مشیت ایزدی سمجھو' میری مانو تو تم اب اس غم کو بھولنے کی کوشش کرو۔"

رئیسہ میری بات کا کوئی جواب دینے کے بجائے مجھے اسی طرح ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ اس کی دراز پلکوں کے گوشے آہستہ آہستہ بھیگنے لگے تھے۔

"ان باتوں سے کچھ حاصل نہ ہو سکے گا میری جان ——— تم مفت میں اپنی صحت گنوا بیٹھو گی۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کچھ دیر تک رئیسہ گم سم بیٹھی رہی پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

"کہو ——— کیا بات ہے؟"

"اگر مجھے کچھ ہو جائے تو آپ مجھے بھولئے گا تو نہیں!"

"کیسی باتیں کرتی ہو۔" میں نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر جواب دیا۔ پھر پوچھا "کہیں تم نے کوئی خواب تو نہیں دیکھا۔"

"ہاں ———" رئیسہ کی آواز لرز رہی تھی۔ "میں نے اپنے منے کو دیکھا

ہے' وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اشارہ کر کے مجھے اپنی طرف بلا رہا تھا ——— اسے میری ضرورت ہے شاید۔"

"وہم ہے تمہارا۔" میں نے جلدی سے کہا ——— "ٹھہرو' میں ڈاکٹر کو فون کر کے بلاتا ہوں۔ تمہاری طبیعت اس وقت زیادہ خراب معلوم ہوتی ہے۔"

پھر کسی تاخیر کے بغیر میں نے ڈاکٹر کو فون کر دیا اور اسے فوراً بنگلے آنے کی تاکید کر کے دوبارہ مسہری پر جا کر رئیسہ کو سمجھانا شروع کر دیا۔

ڈاکٹر نے پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی رئیسہ کا معائنہ کرنے کے بعد اس نے مجھے یہی بتایا تھا کہ معمولی قسم کی گھبراہٹ ہے جو صبح تک جاتی رہے گی۔ پھر اس نے نیند کا انجکشن نکالا' اور سرنج بھرنے لگا ——— میرا خیال بھی یہی تھا کہ رئیسہ کو اس وقت سکون کی ضرورت ہے اور نیند کا انجکشن لگنے کے بعد وہ آرام سے سو جائے گی ڈاکٹر انجکشن تیار کرنے میں مصروف تھا اور میں اس کے قریب ہی کھڑا رئیسہ کو دیکھ رہا تھا جو مسہری پر لیٹی تیز سانسیں لے رہی تھی ڈاکٹر سرنج تیار کر کے رئیسہ پر جھکا اور اس کے بازو پر اسپرٹ لگانے لگا' لیکن اس سے پیشتر کہ وہ انجکشن لگاتا رئیسہ چیختی ہوئی اٹھ بیٹھی اور ہذیانی انداز میں بولی۔

"نہیں نہیں ——— مجھے مت روکو ——— میں جاؤں گی ——— ضرور جاؤں گی ——— میرا منا بلا رہا ہے ——— دیکھو ——— دیکھو وہ مجھے اشارہ کر رہا ہے' اور یہ عورت کون ہے جس نے میرے منے کو پکڑ رکھا ہے ——— چھوڑ دے ——— چھوڑ دے میرے منے کو۔"

رئیسہ تڑپ کر پاگلوں جیسے انداز میں مسہری سے نیچے آ گئی اور دیوانہ وار بھاگتی ہوئی خواب گاہ سے باہر نکل گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے آواز دیتا ہوا لپکا لیکن بیرونی راہداری میں قدم رکھتے ہی ٹھٹھک کر رک گیا اور حیرت سے آنکھیں پھاڑے رئیسہ کو گھورنے لگا جو فرش پر چت پڑی تھی اور اس کے منہ سے بالکل اسی انداز میں گاڑھا گاڑھا خون ابل رہا تھا جیسے میں نے سالگرہ کے موقع پر اپنے لڑکے کے منہ سے ابلتے دیکھا تھا۔

"یہ کیا ہو گیا اچانک۔"

ڈاکٹر کی آواز میرے کان سے ٹکرائی تو میں یوں چونک پڑا جیسے میں ابھی تک خواب دیکھ رہا تھا۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ میں دوڑ کر رئیسہ سے لپٹ گیا تھا لیکن رئیسہ کا حرکت کرتا ہوا جسم ایک لمحے میں بے جان ہو گیا تھا۔

ان واقعات کو گزرے آج تقریباً" ساڑھے اٹھارہ سال ہو چکے ہیں۔ اس وقت میری عمر اکیاون سال ہے' میرے پاس بے حساب دولت ہے۔ میں جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہوں مجھے میری توقع سے بڑھ کر فائدہ ہوتا ہے لیکن مجھے کسی لمحے سکون نہیں کبھی مجھے اپنی پہلی بیوی کی یاد ستاتی ہے۔ کبھی مجھے رئیسہ کی دردناک موت یاد آ جاتی ہے جو اپنے بچے کو کسی عورت کے چنگل سے چھٹکارا دلانے کے لئے اٹھ کر بھاگی تھی اور لقمہ اجل بن گئی اور کبھی مجھے اپنے لڑکے کی موت تڑپا جاتی ہے جو بھری محفل میں میری گود میں مرا تھا۔

میری پہلی بیوی لکشمی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ رئیسہ اور میرے لڑکے کو نہ جانے کس جرم کی پاداش میں اجل نے مجھ سے چھین لیا۔ اب میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ میں ہوں اور میری زندگی کی نہ ختم ہونے والی تلخیاں ——— آج جب میں اس خونچکاں واقع کو قلم بند کر رہا ہوں۔ مجھے بڑی شدت سے لکشمی کا انتظار ہے میں لکشمی کی دولت اسے واپس کرنا چاہتا ہوں اور اس بار خود کو قربان کرنا چاہتا ہوں۔ مگر مجھے موت نہیں آتی۔ موت ان لوگوں کو آ جاتی ہے جنھیں اس کا انتظار نہیں ہوتا ——— اور لکشمی نے شاید بھینٹ لینی بند کر دی ہے۔



"گوریلا"

گو کہ نیکرو فیلزم لغت کے مطابق مردہ جسموں سے جنسی فعل کرنے کی خواہش کو کہتے ہیں لیکن اس وقت جو لوگ باورچی خانے میں پڑی ہوئی لاش کو دیکھ رہے تھے۔ اس کے لئے کسی وضاحت کی خاطر مطلق کوئی ڈکشنری درکار نہیں تھی۔ لاش کے ساتھ کیا سانحہ گزرا تھا وہ سب پر عیاں تھا۔

اس کا نام کلارا نیومن تھا۔ وہ ایک پچاس سالہ قبول صورت غیر شادی شدہ عورت تھی مگر اس وقت جب کہ وہ باورچی خانے کے فرش پر بے حس و حرکت پڑی تھی اس کے چہرے سے روحانی کرب کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کے جسم پر موجود لباس جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا اور نیلے رنگ کی لکیریں جو جارحانہ اذیت کا بین ثبوت تھیں۔ اس کی خوبصورت گردن اور جسم کے دیگر عریاں حصوں پر صاف نظر آ رہی تھیں۔ تیسری منزل کا یہ حصہ جس میں سین فرانسسکو کیلیفورنیا کا درمیانہ طبقہ آباد تھا' اقدام قتل کی ایک خوفناک کہانی سنا رہا تھا۔ مردہ جسم کی طرح وہاں موجود سازو سامان کی حالت بھی ابتر تھی۔ ایک کرسی ٹوٹی پڑی تھی۔ میز پر رکھا ہوا ٹیبل لیمپ چکنا چور نظر آ رہا تھا اور بھی بہت ساری چیزیں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ لاش کی کیفیت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ مرنے والی نے آخری وقت تک اپنے بچاؤ کی خاطر بھرپور جدوجہد کی ہے لیکن اس دردناک موت سے نجات حاصل نہ کر سکی جو قاتل کے ہاتھوں اس کا مقدر بن چکی تھی تحقیق کرنے والے افسران نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ کلارا نیومن کو پہلے بیدردی سے قتل کیا گیا۔ بعد ازاں قاتل نے وحشیوں جیسے انداز میں اس کے ساتھ برا فعل کیا۔

لیفٹیننٹ چارلس ڈولیا' جاسوس ایلن میکگن اور چارلس آئرڈیل نے اپنے اعلیٰ

افسر کیپٹن فلنکن کو جو رپورٹ پیش کی اس میں بتایا گیا تھا کہ انہوں نے مقتولہ کے قریبی رشتے داروں سے جو اس کے ساتھ پہلی اور دوسری منزل پر رہتے تھے پوچھ گچھ کی جنہوں نے یہ بتایا کہ تیسری منزل کا وہ کمرہ جہاں مس نیومن کو قتل کیا گیا کرائے کے لئے خالی تھا اور مقتولہ اسے کسی اچھے اور مناسب کرائے دار کو دینا چاہتی تھی۔ مقتولہ کے ایک عزیز دار نے تحقیق کرنے والے افسران کو بتایا تھا کہ اس نے ایک نووارد کو گھر سے نکلتے دیکھا تھا لیکن اس پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا تھا۔ نووارد کے حلیے کی تفصیلی وضاحت کرتے ہوئے اس نے بتایا تھا کہ نووارد لانبے قد کا مالک تھا۔ اس کے کاندھے غیر معمولی طور پر چوڑے تھے' اس نے نیلے رنگ کا دھاریوں والا سوٹ پہن رکھا تھا۔ نووارد نے اس سے کہا تھا کہ وہ تیسری منزل کو کرائے پر لینے کے بارے میں جلد ہی کوئی آخری فیصلہ کر کے بتا دے گا' مقتولہ کے رشتے دار نے اپنا ایک ذاتی خیال ظاہر کیا تھا کہ نووارد بات چیت اور پہناوے کے اعتبار سے برطانوی نژاد معلوم ہوتا تھا۔

"من موجی اور آوارہ خصلت" لیفٹیننٹ ڈولیا نے غور و خوض کے بعد کہا۔ "یہ ڈاکہ زنی یا لوٹ مار کی واردات نہیں معلوم ہوتی۔ نووارد ایک خالی حصہ کرائے پر حاصل کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ نیک دل خاتون نووارد کو مکان کا خالی حصہ دکھانے کی غرض سے تیسری منزل پر لے گئی۔ قاتل یقینی طور پر ایک مضبوط' جنگلی اور درندہ صفت انسان تھا۔ انسان کے روپ میں ایک سادگی پسند بوزنہ (گوریلا) مگر نفرت اور سفاکانہ خصلتوں سے بھرپور۔"

جاسوسوں کو جائے وقوعہ سے صرف تین فنگر پرنٹ ملے۔ انہیں کامل یقین تھا کہ یہ شہادت قاتل کو گرفتار کرنے میں بڑی معاون ثابت ہو گی لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ چنانچہ پولیس نے تمام جنسی رجحانات رکھنے والے اور عادی مجرموں کو حراست میں لے کر پوچھ گچھ شروع کی اور ایسے تمام افراد کی مقتولہ کے رشتے داروں کے سامنے شناختی پریڈ کرائی گئی لیکن مطلوبہ مجرم ان کی گرفت میں نہ آ سکا۔ کلارا نیومن کے قتل پر کام کرنے والے تمام جاسوس قاتل کی گرفتاری کے سلسلے میں پریشان تھے خصوصاً" جاسوس ڈولیا اپنے ذاتی تجربے اور سابقہ جنسی جرائم کے پیش

نظر اس بات پر بڑی سنجیدگی سے غور کر رہا تھا کہ جنسی جرائم کرنے والے کس قدر خطرناک ہوتے ہیں اور یہ کہ اگر انہیں فوراً" گرفتار نہ کیا جائے تو اپنی درندگی کا سلسلہ بلا خوف و خطر اس وقت تک جاری رکھتے ہیں جب تک پولیس کی گرفت میں پھنس کر بے بس نہ ہو جائیں۔ ڈولیا کا ذاتی نظریہ یہی تھا کہ اگر کلارا کے قاتل کو فوراً" گرفتار نہ کیا تو وہ یقیناً" کوئی جرم کر بیٹھے گا۔

○

جن افراد کو حراست میں لیا گیا تھا پولیس تمام رات ان سے سوالات کرتی رہی ان میں ایک بھی کار آمد ثابت نہ ہوا نہ ہی ان میں سے کوئی اس حلیے سے ملتا جلتا تھا جو مقتولہ کے رشتے دار نے پولیس کو بتایا تھا صبح ہوئی تو جاسوسوں نے اپنی ناکامی کی رپورٹ اپنے چیف کو دے دی۔ چیف میتھسن بھی ان رپورٹوں سے کوئی آخری نتیجہ اخذ کرنے سے قاصر تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ قاتل کی درندگی کا بین ثبوت تھی۔ پولیس سرجن جس نے مقتولہ کا پوسٹ مارٹم کیا تھا اپنی رپورٹ میں یہی ظاہر کیا تھا کہ مقتولہ کو کسی ٹھوس چیز سے ضرب لگا کر ہلاک کیا گیا ہے۔ اس کے سر کو اس وقت تک زمین سے ٹکرایا گیا جب تک وہ مر نہ گئی۔ لاش کے گلے پر ملنے والے نشانات کے بارے میں یہ بات بڑے وثوق سے لکھی تھی کہ وہ قاتل کے انگوٹھے کے نشانات ہیں۔ مقتولہ کی ٹانگ کی ہڈی بھی گھٹنے کے پاس سے ٹوٹی ہوئی تھی جس سے صاف ظاہر تھا کہ قاتل نے جنسی فعل کا ارتکاب کرنے سے پہلے مقتولہ کو بڑی بے رحمی اور سنگدلی سے مارا تھا۔

جاسوسوں نے دوسرا ہفتہ بھی کلارا نیومن کے قاتل کو تلاش کرنے میں صرف کیا۔ انہوں نے ہر اس اطلاع یا افواہ کی چھان بین کی جو مختلف ذرائع سے موصول ہوئی تھیں۔ مشکوک مجرموں پر بھی کڑی نگرانی کی گئی لیکن نتیجہ صفر رہا۔ ابھی وہ نیومن کے پیچیدہ کیس کو حل کرنے میں منہمک تھے کہ ٹھیک بارہ روز بعد 2 مارچ کو انہیں ایک خوفناک حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔ اس بار ان کی تفتیش کا مرکز سین جوز تھا جو سین فرانسسکو سے ساٹھ میل دور جنوب میں واقع تھا۔

اس دفعہ قاتل کا شکار مسز ہاروے بیل تھی جو ایک امیر کبیر شخص کی بیوی تھی۔ مسز ہاروے کو ایک ایسے خالی مکان میں مردہ پایا گیا جو اس کے شوہر کی ملکیت تھا۔ مسٹر ہاروے کو اس وقت خطرے کا احساس ہوا جب اس کی بیوی رات کے کھانے پر اس کے ساتھ شریک نہ ہوئی۔ اس نے پہلے اپنے واقف کاروں سے فون پر رابطہ کر کے اپنی بیوی کے بارے معلومات حاصل کرنی چاہیں لیکن جب اسے مایوسی ہوئی تو اس نے فوراً" اپنے تمام کرائے داروں سے پوچھ گچھ کی اور بعدازاں پولیس کو حالات سے مطلع کر دیا۔ پولیس کی ایماء پر ہی اس نے خالی مکان کو کھولا تھا وہاں جو منظر پولیس والوں کو نظر آیا وہ خاصا سنسنی خیز ثابت ہوا۔ مسز ہاروے ایک بستر پر پڑی تھی۔ اس کا جسم برف کی مانند سرد پڑ کر اکڑ چکا تھا۔ اس کا گلا بری طرح زخمی تھا۔ تفتیش کرنے والے افسران نے فوری طور پر یہی نتیجہ اخذ کیا کہ مسز ہاروے کو اسی کے ڈریسنگ گاؤن کی باریک ڈور سے قتل کیا گیا ہے۔ کمرے کا ماحول ایک بار پھر وہی کہانی دہرا رہا تھا جو کلارا نیومن کے قتل کے سلسلے میں پولیس والے دیکھ چکے تھے۔ مسز ہاروے کے جسم پر پائے جانے والے نشانات اور کمرے میں پھیلی ہوئی افراتفری یہی ظاہر کرتی تھی کہ مقتولہ مرنے سے پیشتر آخری دم تک اپنے بچاؤ کے لئے قاتل سے برسرپیکار رہی ہے۔

پولیس والوں نے عمارت کے دیگر مکینوں اور قرب و جوار میں رہنے والوں سے پوچھ گچھ کی جو اس واردات سے بری طرح خوف زدہ تھے۔ جاسوسوں کو جو معلومات ملیں وہ کلارا نیومن کے قاتل سے ملتی جلتی تھیں۔ ایک شخص نے ڈرتے ڈرتے پولیس کو یہ اطلاع فراہم کی کہ اس نے صبح کے وقت ایک نووارد کو مکان سے نکلتے دیکھا تھا جو دراز قد تھا۔ اس کے کاندھے خاصے کشادہ تھے۔ وہ پتلی گردن اور دراز بازوؤں کا مالک تھا اور اس نے نیلی دھاریوں والا سوٹ پہن رکھا تھا۔

بارہ دن میں قتل کی دو سفاکانہ وارداتوں نے پورے علاقے میں سنسنی پھیلا دی۔ سین فرانسسکو اور سین جوز کے عوام ان دونوں واردات سے بہت زیادہ خائف تھے۔ اخباروں نے پولیس اور جاسوسوں کے خلاف بڑی شدت سے لے دے مچا رکھی تھی۔ ایک اخبار نے پولیس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ایک شیطان صفت گوریلا

انسان کے بھیس میں کیلیفورنیا میں آزادانہ گھوم رہا ہے اور بے گناہ عورتوں کو اپنے ظلم کا نشانہ بنا رہا ہے لیکن پولیس عوام کو اس درندے کے شر سے بچانے میں، بری طرح ناکام ثابت ہو رہی ہے۔

پولیس کی طرف سے اخبارات میں جو اعلان شائع ہوا اس میں عورتوں کو خاص طور پر ہدایت کی گئی کہ اگر کوئی شخص ان کے خالی مکان کو دیکھنے آئے تو اس وقت تک نووارد کو اندر نہ داخل ہونے دیں، جب تک اس کے بارے میں پوری طرح اطمینان نہ کر لیں۔ پولیس نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ ان کا مطلوبہ قاتل آئندہ پھر کسی ایسے ہی مکان کی طرف متوجہ ہو گا جہاں "کرائے کے لئے خالی" کی تختی آویزاں ہو گی۔ اس کے ساتھ ہی پولیس کی جانب سے مطلوبہ قاتل کا حلیہ بھی اخبارات میں شائع ہوا تاکہ زیادہ سے زیادہ عوام اس سنگدل مجرم کے بارے میں جان سکیں سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ خود پولیس والوں نے بھی اس قاتل کو انسان کے بھیس میں ایک گوریلا تسلیم کیا تھا۔

اخبارات میں قاتل کے متعلق اطلاعات کا شائع ہونا تھا کہ بے شمار عورتوں نے پولیس والوں سے رابطہ قائم کیا اور مختلف بیانات دیئے لیکن ان میں سے تین عورتیں ایسی تھیں جنہوں نے بڑے وثوق سے بتایا کہ وہ پولیس کے مطلوبہ آدمی کو نہ صرف یہ کہ دیکھ چکی ہیں بلکہ اس سے گفتگو بھی کی ہے۔ یہ تینوں عورتیں اتفاق سے ایسے مکانوں کی مالک تھیں جو کرائے پر دیئے جاتے تھے۔ چنانچہ قاتل نے ان تینوں پر بھی قسمت آزمانے کی کوشش کی لیکن اتفاق سے اس وقت ان تینوں عورتوں میں سے کسی ایک کے پاس بھی کوئی کمرہ خالی نہ تھا۔ اس لئے قدرت نے انہیں قاتل کی سنگدلی سے محفوظ رکھا۔ ان عورتوں نے پولیس کو قاتل کا جو حلیہ بتایا وہ ہو بہو کلارا نیومن اور مسز ہاروے کے قاتل سے ملتا تھا۔

سین جوز کے افسروں نے بھی مسز ہاروے کے قاتل کی گرفتاری کے سلسلے میں وہی طریقہ کار اختیار کیا جو مس کلارا نیومن کے سلسلے میں ان کے دوسرے ہم پیشہ فرانیسکو میں اختیار کر چکے تھے۔ مشتبہ افراد اور جرائم پیشہ مجرموں کو حراست میں لے کر ان سے پوچھ گچھ کی گئی لیکن کوئی کار آمد نتیجہ نہ نکلا۔ بہر حال علاقے کے تمام

پولیس اسٹیشنوں پر قاتل کے سلسلے میں معلومات پہنچا دی گئیں اور سختی سے ہدایت کی گئی کہ اگر گوریلا نما آدمی انہیں کہیں نظر آئے تو اسے فوراً" گرفتار کر لیا جائے اور اگر وہ فرار ہونے کی کوشش کرے تو اسے بے دریغ گولی مار دی جائے۔ اس ہدایت کے بعد پولیس والوں نے ہر اس شخص کو دبوچنا شروع کر دیا جو قاتل کے حلیے سے تھوڑا بہت بھی ملتا جلتا تھا۔ گرفتار ہونے والوں کی باقاعدہ شناختی پریڈ کرائی جاتی اور پھر پولیس انہیں خفیف ہو کر آزاد کر دیتی۔ اسی ضمن میں جب پولیس والے ایک ایسے مستری کو پکڑ لائے جو سنسان گلیوں میں لڑکیوں کو چھیڑنے کا عادی تھا تو پولیس سارجنٹ نے بری جھلاہٹ سے اپنے بھاری بھرکم سر کو جھٹکتے ہوئے کہا تھا۔

"میری رائے میں یہ بھی ایک اچھے کردار کا انسان نہیں ہے۔ تم لوگ چاہو تو مقتولہ کے عزیزداروں کے سامنے اس کی شناختی پریڈ بھی کرا سکتے ہو لیکن یہ وہ مطلوبہ شخص نہیں ہو سکتا جو غلیظ اور خارش زدہ کتے کی طرح پورے شہر میں مشہور ہو چکا ہے۔"

"دوسری طرف کلارا نیومن کا کیس بھی پولیس کے لئے ایک معمہ بن چکا تھا۔ جاسوسوں نے اپنی حتی الامکان کوشش کے بعد یہ رپورٹ لکھ کر کہ کلارا نیومن اور مسزاروے کا قتل نا قابل حل ہے۔ فائل کو داخل دفتر کر دیا۔ لیکن ابھی وہ سکون کا ایک لمحہ بھی نہ گزار سکے تھے کہ انہیں ایک اور حادثے کی اطلاع موصول ہوئی۔ پولیس کے افسران جس وقت بمشکل تمام مطلوبہ مکان تک پہنچے تو یہ دیکھتے ہی ان کو پسینہ آ گیا کہ وہاں بھی "کرائے کے لئے خالی" کی تختی آویزاں تھی۔ بہر حال وہ لوگوں کے ہجوم کو چیرتے پھاڑتے وہاں تک پہنچ ہی گئے' جہاں ایک عورت کی مسخ شدہ لاش ان کی منتظر تھی۔

مسز للین اپنے مکان کے اس حصے میں بستر پر مردہ پڑی تھی جس کے بارے میں اس نے اخبار میں اشتہار دیا تھا۔ اس کا نیم عریاں جسم پر جابجا خراشیں اور گہرے زخم کے نشان موجود تھے۔ کمرے میں ہر طرف افراتفری پھیلی نظر آتی تھی۔ مقتولہ کی گردن اور چہرے پر خون کے لوتھڑے جمے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اس کے نازک سر پر شدید ضرب کے اثرات بھی نمایاں تھے۔ اسے اس درندگی سے زدو کوب کیا گیا تھا

کہ پسلی کی چھ ہڈیاں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی تھیں جاسوسوں نے مکمل معائنے کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا کہ قاتل کا مقصد لوٹ مار کرنا نہیں تھا بلکہ وہ محض جنسی آسودگی حاصل کرنا چاہتا تھا جس کا ثبوت ہیرے کی وہ انگوٹھی تھی جو مقتولہ کی انگلی میں چمک رہی تھی۔ قاتل نے نیکلس کو بھی ہاتھ نہیں لگایا جو دھینگا مشتی کے دوران مقتولہ کے جسم سے اتر کر فرش پر جا پڑا تھا۔ 63 سال کی اس عورت پر اس کی موت کے بعد جنسی حملہ کیا گیا تھا۔

جاسوسوں نے بڑی سرگرمی کے ساتھ تفتیش کا آغاز کیا لیکن وہ سوائے اس کے کوئی اور بات معلوم نہ کر سکے کہ مسز للین کا قاتل بھی وہی پر اسرار قاتل تھا جو اس سے قبل دو بھیانک جرم کا ارتکاب کر چکا تھا۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور نے جاسوس ڈولیا کو بیان دیتے ہوئے کہا:

"جناب! میں نے رات دو بجکر چالیس منٹ پر ایک شخص کو اپنی ٹیکسی پر بٹھایا تھا۔ وہ شخص لانبے قد کا مالک تھا۔ اس کے شانے بہت زیادہ کشادہ تھے اس نے نیلے رنگ کا دھاریوں والا سوٹ پہن رکھا تھا۔ محض ایک فرلانگ جانے کے بعد اس نے مجھے ٹیکسی روکنے کو کہا پھر نیچے اتر کر بل کی ادائیگی کی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس مکان (جہاں قتل ہوا تھا) کی سمت چلا گیا۔ مجھے اس پر کچھ شبہ ہوا تھا اس لئے میں اس وقت تک اپنی ٹیکسی میں بیٹھا اسے دیکھتا رہا' جب تک وہ مکان میں داخل نہیں ہو گیا۔ اس کے بعد میں چلا گیا تھا۔ بہر حال وہ شخص کچھ بے چین نظر آتا تھا۔"

ٹیکسی ڈرائیور کا بیان بھی اس قاتل کی نشاندہی کر رہا تھا جواب تک پولیس کے لئے درد سر بنا ہوا تھا۔ جاسوس ڈولیا نے قاتل کو گرفتار کرنے کے لئے جان توڑ کوشش شروع کر دی۔ قرب و جوار میں بسنے والے لوگوں سے جو بری طرح خوفزدہ تھے پوچھ گچھ کی گئی لیکن کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ یا تو وہ لوگ حقیقتاً" کچھ نہیں جانتے تھے یا پھر یہ بھی ممکن تھا کہ وہ قاتل سے دہشت زدہ ہو گئے تھے اور اس کے بارے میں اپنی زبان کھولتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔ پولیس والوں نے مقتولہ کے شوہر اور اس کے لڑکے کا بیان بھی لیا۔ لیکن وہ بھی کوئی کار آمد بات بتانے سے قاصر تھے۔

تفتیش کرنے والے افسران اس بات پر متفق تھے کہ قاتل وہی نیلے رنگ کے

سوٹ والا گوریلا ہے جو مسز للین سے پیشتر مسز ہاروے اور کلارا نیومن کو اپنے سفاکانہ اور بھیانک جرم کا نشانہ بنا چکا تھا۔ پولیس کا خیال تھا کہ قاتل صرف بوڑھی عورتوں کو اپنی جنسی درندگی کا نشانہ بناتا ہے لیکن پولیس اور سراغرسانوں کا یہ نظریہ بھی اس وقت بیکار ثابت ہوا جب ایک پندرہ سالہ لڑکی المیڈا قاتل کا شکار ہوتے ہوتے بچی۔ نیلے سوٹ والے گوریلے نے مسز للین کو پیش آنے والے حادثے کے دو دن بعد المیڈ کو اپنی درندگی کا ہدف بنانے کی کوشش کی تھی۔

نابالغ لڑکی المیڈا وقوعے والے روز جب اسکول سے اپنے گھر پہنچی تو گھر میں کوئی بھی موجود نہ تھا حتیٰ کہ اس کی ماں بھی کہیں پڑوس میں گئی ہوئی تھی۔ لڑکی کو ابھی گھر میں داخل ہوئے چند منٹ گزرے تھے کہ باہر سے گھنٹی بجائی گئی۔ لڑکی جب دروازے پر آئی تو وہاں ایک مہذب شکل و صورت کا آدمی موجود تھا جس نے کسی خالی کمرے کے بارے میں دریافت کیا۔ المیڈا نے اس وقت نووارد کے بارے میں کچھ بھی نہ سوچا اور اسے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ دوسرے ہی لمحے نووارد نے پشت سے المیڈا پر خطرناک حملہ کیا اور اسے بستر کی طرف گھسیٹنے لگا۔ اس نے اپنے ٹھوس گھٹنے سے لڑکی کے معدے پر اتنی شدید ضربات لگائیں کہ وہ درد سے بلبلا اٹھی۔ نووارد نے اس کو چیختا دیکھا تو اس نے اپنی مضبوط انگلیاں اس کی نازک گردن پر جما دیں اور گلا گھونٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ المیڈا کو سینے میں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد جب قاتل کو یقین آگیا کہ اس کا شکار اب بے بس ہو گیا ہے تو اس نے جھپٹ کر بیرونی دروازے کی چٹخنی لگا دی۔ لڑکی جو بری طرح خائف تھی سہمی ہوئی کھڑی رہی لیکن جب اس نے قاتل کو جو شراب کے نشے میں دھت تھا دوبارہ اپنی طرف آتے دیکھا تو ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔ قاتل بڑے خطرناک ارادے سے اس کی طرف لپکا لیکن ٹھیک اسی وقت دروازے کے ساتھ رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بج اٹھی اور قاتل یہ سمجھا کہ شاید وہ دروازے کی کال بیل ہے اس آواز سے وہ گھبرا گیا۔

المیڈا نے پولیس کو اس واردات کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا تھا۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ شخص جو شکل و صورت کے اعتبار سے ایک شریف آدمی نظر آتا تھا اس قدر کمینگی کا ثبوت دے گا۔ اس نے مجھے بری طرح زد و

کوب کیا تھا لیکن ٹیلیفون کی گھنٹی نے میری جان بچا لی اور وہ شخص ایک کھڑکی کے راستے فرار ہو گیا۔ میں خوف کے مارے اس کو ٹھیک طور پر نہ دیکھ سکی لیکن اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ اس میں ایک ایسی ہی طاقت تھی جیسے کسی جنگلی بھینسے کے جسم میں ہوتی ہے۔“

المیڈا کے بیان نے جاسوسوں کو ایک بار پھر اسی قاتل سے نبرد آزما ہونے پر مجبور کر دیا جو اب تک ان کے لئے ایک چھلاوہ بنا ہوا تھا۔ چنانچہ پولیس کی ایک بھاری جماعت کو مجرم کی گرفتاری پر معمور کر دیا گیا۔ اخبارات کے ذریعے عوام کو ہوشیار کیا گیا کہ وہ نیلے سوٹ والے گوریلے سے محتاط رہیں۔ سمندر کے ساتھ پھیلا ہوا وسیع علاقہ جو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے گھرا ہوا تھا اور جہاں قاتل بہ آسانی چھپ سکتا تھا۔ پولیس کی زیر نگرانی آ گیا۔ پولیس کی اسلحہ سے لیس ٹولیاں ہمہ وقت شہر میں چکر لگانے لگیں، اور تمام اہم مقامات کی ناکہ بندی کر دی گئی تاکہ قاتل کے فرار کی راہیں مسدود ہو جائیں۔ ساحل سے مال بردار کشتیوں کو اس وقت تک روانگی کی اجازت نہیں تھی، جب تک پولیس کے افسران اس کی مکمل تلاشی لے کر اجازت نہ دیں۔

پولیس کی اس سرگرمی میں عوام بھی برابر کے شریک تھے اور مکمل تعاون کر رہے تھے۔ اخبارات پولیس اور جاسوسوں کی نا اہلی پر بڑے بڑے کالم لکھ رہے تھے اور اس بات پر زور دے رہے تھے کہ گوریلا صفت انسان کو جلد از جلد گرفتار کر کے پھانسی پر لٹکا دیا جائے لیکن نیلے سوٹ والے گوریلے پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے المیڈا پر ناکام حملے کے ٹھیک چوبیس گھنٹے بعد ایک اور عورت پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ اس بار قاتل کے اقدام نے اس شبے کو یقین میں بدل دیا کہ وہ انتہائی بیدرد اور ظالمانہ رجحان رکھتا ہے اور انسانی جذبات اور احساسات سے اسے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔

”میری بیوی شدید بیمار تھی۔“ عورت کے شوہر نے جو اس واردات پر دیوانگی کی حدود کو چھو رہا تھا۔ پولیس کے سوال پر چلاتے ہوئے کہا ”ابھی کچھ روز پہلے ہی اس کا ایک خطرناک آپریشن ہوا تھا اور اب ———— اب وہ ....“

”میں پولیس سے گفتگو کر سکتی ہوں۔“ شوہر کا جملہ مکمل ہونے سے پیشتر ہی

خوابگاہ سے ایک درد میں ڈوبی ہوئی نسوانی آواز ابھری۔ پولیس والے خواب گاہ میں گئے تو انہوں نے ایک نوجوان مگر معذور عورت کو دیکھا جس کا چہرہ خوف کے مارے ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اس نے سسکتے ہوئے خوفزدہ آواز میں پولیس کو بتایا۔

"میں کمرے میں کچھ آہٹ سن کر جاگی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کمرے میں ایک شخص موجود ہے جو اپنے کپڑے اتار رہا ہے۔ میں خوف سے چلائی تو وہ مجھ پر جھپٹ پڑا اور مجھے مارنے لگا۔ وہ مجھے ختم کرنا چاہتا تھا' لیکن میں نے ہمت کر کے اسے بتایا کہ ابھی دو ہفتے پیشتر میں ایک خطرناک آپریشن سے دو چار ہو چکی ہوں۔ میں نے اس سے رحم کی درخواست کی۔ وہ میرے چہرے پر وحشت ناک انداز میں جھکا ہوا تھا۔ اس کی سانس کسی لوہار کی دھونکنی کی طرح تیز تیز چل رہی تھی۔ اس کے غلیظ منہ سے ٹپکنے والی رال میرے چہرے پر تعفن پھیلا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں وحشیانہ اور خطرناک نظر آ رہی تھیں۔

"وہ منحوس شخص میرے اوپر جھکا سب کچھ سنتا رہا لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کمرے میں ہر طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی لیکن باہر کھلنے والی کھڑکی سے اتنی روشنی آ رہی تھی جس میں اس کے خوفناک چہرے کو دیکھ سکتی تھی۔ میں نے اسے خاموش پا کر جب دوبارہ چلا کر اپنے آپریشن کے بارے میں بتایا تو وہ یکلخت دیوانہ بن گیا اور میری چھاتی اور پیٹ پر مکوں سے شدید ضرب لگانے لگا۔ اس نے اپنے وزنی سر سے میری پیشانی پر ٹکریں بھی ماری تھیں۔ پھر اچانک باہر دروازے پر شور کی آوازیں ابھریں تو وہ اچھل کر مجھ سے دور ہو گیا ور تیزی سے اپنے کپڑے سمیٹ کر اندھیرے میں فرار ہو گیا۔"

پولیس کے کارندے ابھی اس عورت سے مزید سوالات کرنا چاہتے تھے لیکن ڈاکٹر کے آ جانے سے انہیں سوالات کا سلسلہ روکنا پڑا خونیں حملے نے عورت کی حالت ابتر کر دی تھی اور وہ تمام ٹانکے بھی ٹوٹ چکے تھے جو آپریشن کے وقت اسے لگائے گئے تھے۔

عورت کے شوہر نے پولیس کو بتایا کہ وہ واردات سے دو گھنٹے قبل ایک ٹھیکے کے سلسلے میں کسی پارٹی سے آخری بات کرنے کی غرض سے باہر گیا تھا۔ اسی دوران قاتل

نے اس کے مکان کی کھڑکی پر "کرائے کے لئے خالی ہے" کی تختی دیکھی اور اندر گھس گیا اور بے بس اور لا چار عورت کی روداد سننے کے باوجود اس پر حملہ کر بیٹھا۔

عوام میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا وہ اس حادثے کے بارے میں مختلف لوگوں کے نام لے رہے تھے جن میں مشہور زمانہ بدمعاش جیک اور دوسرے ایسے افراد کے نام بھی تھے جو جنسی جنونی سمجھے جاتے تھے اور جنسی جرائم کے ارتکاب کے وقت پاگل ہو جاتے تھے۔ عورتوں نے اس واقعے کا بڑا گہرا اثر لیا۔ جب وہ اپنے گھروں پر تنہا ہوتیں تو اپنے مکان کی کھڑکیاں اور دروازے بند رکھتیں۔ جن مکانات پر "کرائے کے لئے خالی" کی تختیاں آویزاں تھیں انہیں فوری طور پر اتار لیا گیا۔ سین فرانسسکو ایک ایسا شہر بن گیا جس پر خوف و ہراس کی حکمرانی تھی۔ ہر شخص کسی نئے پیش آنے والے خونیں حادثے کا خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ پولیس کے کارندے اور جاسوس بھی اس بات سے خائف تھے کہ نیلے سوٹ والا گوریلا کب دوسری واردات کرتا ہے اور کب اخبارات کی سرخیاں ان کی نا اہلی کی کہانی سناتی ہیں۔ غرض یہ کہ پولیس اور گوریلا صفت انسان میں ایک خطرناک جنگ چھڑی ہوئی تھی جس کا انجام کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔

پولیس کی جانب سے عوام اور خصوصاً" عورتوں کو وارننگ دی گئی کہ اگر وہ کسی اجنبی کو اپنے مکان کے پاس دیکھیں تو فوری طور پر اس کی اطلاع پولیس کو فراہم کریں۔ پولیس نے اس بار نیلے سوٹ والے گوریلے کا تفصیلی حلیہ یوں جاری کیا کہ وہ لانبا شخص ہے بھاری بھر کم اور مضبوط قوی رکھتا ہے۔ اس کا وزن تقریباً" ایک سو ستر پونڈ ہے۔ بظاہر وہ محتاط' مہذب اور ملنسار نظر آتا ہے اور برطانوی باشندہ معلوم ہوتا ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی پولیس نے اپنے تمام محکمے کے افسران اور ماتحتوں کے نام یہ اپیل جاری کی کہ وہ بیگناہ عوام اور عورتوں کو گوریلا خصلت انسان کی درندگی سے محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کریں اور اگر وہ کہیں نظر آ جائے تو اسے گولی مارنے سے بھی دریغ نہ کریں۔

ان تمام اقدامات' اطلاعات اور اخبارات میں آئے دن شائع ہونے والی خبروں کے باوجود نیلے سوٹ والا گوریلا بغیر کسی کی نظروں میں آئے شہر میں آزادی کے ساتھ

موجود تھا۔

جون کے وسط میں گوریلا صفت درندے نے ایک بار پھر پولیس اور عوام میں خوف کی لہر دوڑا دی اس بار اس نے اپنے حملے کے لئے ایک نئے مرکز کا انتخابات کیا تھا۔ سانتا باربرا جو ایک خوبصورت رہائشی علاقہ تھا اور اپنی خوبصورتی کی وجہ سے کسی ہسپانوی ریاست کی یاد دلاتا تھا اس کا مرکز بن گیا۔

اس بار قاتل نے ایک ہوٹل کی مالکن مسز اولی رسل کو جنسی درندگی کا نشانہ بنایا تھا۔ حسب معمول اس نے پہلے اپنے شکار کو بڑی بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتارا پھر اس کے ساتھ جارحانہ جنسی فعل کا ارتکاب کیا اور اس کے بعد عورت کی مسخ شدہ لاش کو ہوٹل کے ایک خالی کمرے میں بے گور و کفن چھوڑ کر فرار ہو گیا۔

ہوٹل کے ایک کرائے دار نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے بتایا کہ اس حادثے سے کچھ دیر قبل اس نے ایک اجنبی کو مسز رسل کے ساتھ کسی خالی کمرے کے بارے میں گفتگو کرتے دیکھا تھا ہوٹل کی ملنسار مالکن اس اجنبی کو اپنے ساتھ لئے اوپری منزل کی طرف چلی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اجنبی تنہا واپس آیا اور خاموشی سے چلا گیا۔ کرایہ دار نے نووارد کا جو حلیہ بیان کیا وہ صد فی صد اسی قاتل گوریلے کا تھا جس کو گرفتار کرنے کے لئے پولیس کا پورا محکمہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ مصروف کار تھا۔ قاتل کا شرمناک اور جارحانہ عمل بھی سابقہ وارداتوں سے ملتا جلتا تھا۔

مسز رسل کی واردات کے ڈیڑھ ماہ بعد نیلے سوٹ والے گوریلے نے ایک اور عورت کو جنسی درندگی کا نشانہ بنا کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ عورت کے شوہر مسٹر اسٹیفن نے اپنی بیوی کی مسخ شدہ اور روندی ہوئی لاش کو اپنے اوک لینڈ والے مکان میں جو کرائے کے لئے خالی تھا پایا تھا۔ قاتل نے اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اس بار بھی مقتولہ کے ساتھ جنسی فعل کا ارتکاب کرنے سے پیشتر بڑی بیدردی سے اسے مارا تھا۔ قریب رہنے والے ایک شخص اور حلقے کے ڈاکئے نے پولیس کو بتایا کہ انہوں نے ایک اجنبی کو مسز اسٹیفن کے ساتھ گفتگو کرتے دیکھا تھا لیکن وہ اجنبی بیحد ہنس مکھ اور مہذب نظر آتا تھا۔ پولیس کو اجنبی کا جو حلیہ بتایا گیا وہ گوریلا صفت انسان سے ملتا تھا۔ مسز اسٹیفن کو قتل کرنے کے دو ماہ کے اندر اندر قاتل نے پورٹ

لینڈ کے علاقے میں تین اور عورتوں کو ٹھکانے لگا دیا لیکن اس کے باوجود وہ پولیس کے تمام حفاظتی اقدامات اور ناکہ بندیوں سے محفوظ تھا۔

اخبارات اور عوام ایک بار پھر چیخ اٹھے۔ "آئندہ کیا ہو گا؟" اس سوال کا جواب کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ پورے شہر میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ تمام اخبارات پولیس کی نا اہلی کا رونا رو رہے تھے اور سخت تنقید کر رہے تھے کہ درندہ صفت قاتل پولیس کی دسترس سے اب تک کیوں آزاد ہے؟" اور کیوں وہ ہر بار ایک نئے جرم کا ارتکاب کرنے کے بعد فرار ہو جانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

پولیس افسران اور جاسوس جو شب و روز نیلے سوٹ والے گوریلے کی گرفتاری میں خاک چھانتے پھر رہے تھے۔ اخبارات کی تنقید اور عوام کی چیخ و پکار پر بری طرح بوکھلائے ہوئے تھے کہ قاتل نے اپنی درندگی کی وارداتوں میں ایک اور اضافہ کر دیا۔ اس بار اس نے برلن گیم کا رخ کیا تھا۔ واقعات کی تفصیل درج ذیل ہے۔

برلن گیم کا وہ چھوٹا سا مکان انتہائی خوبصورت اور دیدہ زیب تھا جہاں رہنے والی عورت اپنے مکان کو صاف کرنے اور فرنیچر کی جھاڑ پونچھ میں مصروف تھی۔ فرنیچر صاف کرتے کرتے وہ خوبصورت عورت ایک لمحے کے لئے رکی اور اپنے شکم میں حرکت کرتے ہوئے بچے کا جائزہ لینے لگی جو عنقریب تولد ہونے والا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا اس بار بھی اس کے ہاں لڑکا ہو گا۔ جیسا کہ اس کے شوہر نے قیاس کیا تھا۔ آنے والے اخراجات کے پیش نظر عورت اور اس کے شوہر نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنے مکان کے ایک حصے کو کرائے پر اٹھا دیں تاکہ زچگی کے مصارف پورے کر سکیں۔ چنانچہ وقوعے والے روز اس عورت نے صبح ہی صبح اپنے مکان کے باہر "کرائے کے لئے خالی" کی تختی لگا دی تھی۔ اور کسی اچھے کرائے دار کی راہ دیکھ رہی تھی لیکن اس کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ تختی اس کے لئے ایک خطرناک حملے کا سبب بن جائے گی۔

جس وقت اس نے بیرونی دروازے پر دستک کی آواز سنی اور لپک کر دروازہ کھولا اس کا چہرہ خوف کے مارے زرد پڑ گیا۔ ابھی وہ نووارد کو مشکوک نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ نووارد نے اسے زور دار دھکا دیا اور خود اندر آ گیا۔ قبل اس کے عورت بچاؤ

کی کوشش کرتی نووارد نے اس پر چھلانگ لگائی اور جنونی انداز میں اسے پیٹنے لگا۔ عورت ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔ اس کی چیخ کی آواز سن کر جب پڑوسیوں نے اسے باہر سے پکارا تو قاتل اس پر آخری بھرپور ٹھوکر لگا کر اٹھا اور پچھلے راستے سے فرار ہو گیا۔ بے بس عورت کو بعد میں اس کے پڑوسیوں نے بیہوشی کی حالت میں ایک قریبی ہسپتال تک پہنچا دیا۔ جہاں ڈاکٹروں نے فوری معائنے کے بعد یہ اندوہناک خبر سنا دی کہ اس کا بچہ پیٹ کے اندر شدید ضربات کی وجہ سے مر چکا ہے۔

اس واقعے نے برلن گیم کو ایک مسلح قلع کی حیثیت دے دی۔ پولیس اور جاسوسوں نے ان تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی جو قاتل کے فرار کا ذریعہ بن سکتا تھا۔ پولیس کی بھاری مسلح جماعت گلی کوچوں میں ٹڈیوں کی طرح منڈلانے لگی۔ مشکوک افراد کو زیر حراست لے کر ان سے پوچھ گچھ کی گئی۔ قصبے کے رہنے والوں نے اپنے گھروں کو تالے لگا دیئے اور وہ اسلحہ جات جو انہوں نے چوری چھپے رکھ چھوڑے تھے نکال لئے تا کہ قاتل کے اچانک حملے کے وقت ان کا استعمال کیا جا سکے۔ تمام لوگ سر شام ہی سے اپنے گھروں پر واپس آ جاتے اور پھر ایک لمحے کے لئے بھی اپنی بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر باہر نہ جاتے۔ اس لئے کہ درندہ صفت گوریلے کا انسانی ہاتھ اب بوڑھی عورتوں کے علاوہ جوان اور کمسن لڑکیوں تک پہنچ چکا تھا۔ وہ بیمار اور معذور عورتوں کو بھی بخشنے کا عادی نہ تھا صرف ابھی تک اس نے سرمایہ داروں کو غالباً اس لئے چھوڑ رکھا تھا کہ وہ مالی اعتبار سے مضبوط تھے اور اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لئے انہیں اپنے مکان کو کرائے پر اٹھانے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔

مسز ولیم بھی ایک مالدار عورت تھی۔ چنانچہ اسے قاتل کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا چنانچہ اس رات بھی جب اسے قتل کیا گیا وہ بڑے اطمینان کے ساتھ اپنے آراستہ کمرے میں سونے کے ارادے سے داخل ہوئی تھی۔ اس کا خوبصورت اور عالی شان مکان جو گولڈن گیٹ پارک کے نزدیک تھا عنقریب فروخت ہونے والا تھا اور اسی "برائے فروخت" کی تختی نے جو اس کے مکان کے پھاٹک پر لگی تھی اس کی جان لے ڈالی۔ نیلے سوٹ والا گوریلا ایک فرانسیسی ساخت کی کھڑکی کے ذریعے مکان میں داخل ہوا۔ اس نے بوڑھی اور بیمار عورت کو بڑی بے دردی اور بے رحمی سے قتل

کیا پھر اس کی عصمت دری کر کے فرار ہو گیا۔

مسز ولیم کا قتل بالکل اسی نوعیت کا تھا جیسا اب تک دوسری وارداتوں میں دیکھا جا چکا تھا لیکن اس بار قاتل نے اپنی سابقہ روایات میں ایک نئے باب کا اضافہ کر لیا تھا۔ وہ مسز ولیم کو قتل کرنے اور اس کی عصمت دری کرنے کے علاوہ اس کے قیمتی زیورات بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا جو ایک نئی حرکت تھی۔ پولیس کو یقین تھا کہ قاتل ان زیورات کو یا تو کہیں رہن رکھنے کی کوشش کرے گا یا پھر انہیں فروخت کر دے گا۔ چنانچہ اس نے فوری طور پر ایک ٹھوس قدم اٹھایا اور اخبارات کے ذریعے اعلان کرایا کہ کوئی بھی صراف یا مالدار شخص کو زیورات کو خرید کرنے یا رہن رکھنے سے پہلے پولیس سے اس کی اجازت ضرور حاصل کرے۔ اس کے ساتھ ہی سادہ لباس والے تمام صرافوں کی دوکانوں پر تعینات کر دیئے تا کہ اگر قاتل چوری کئے ہوئے زیورات لے کر آئے تو اسے گرفتار کیا جا سکے لیکن پولیس کو اپنے ارادے میں مایوسی ہوئی۔

بہر حال تمام سراغرساں اور جاسوس اس بات پر متفق تھے کہ ہر کیس میں ایک موڑ ایسا ضرور آتا ہے جو پولیس کے لئے انتہائی کار آمد ثابت ہوتا ہے کبھی کبھی تو محض ایک جملہ یا ایک نظریہ بھی کسی ایسے قاتل کی گرفتاری کو بڑا آسان بنا دیتا ہے جسے برسوں تک گرفتار نہ کیا جا سکا ہو۔

نیلے سوٹ والے گوریلے کے کیس میں یہ موڑ اس وقت آیا جب پولیس کو ایک ایسی لاش کی اطلاع ملی جو اوکلینڈ کی نواحی بستی کے ایک ویران مکان میں گزشتہ پندرہ روز سے پڑی ہوئی تھی مقتولہ ایک ساٹھ سالہ بڑھیا تھی جو اپنے فارم کی تنہا مالک تھی اور اپنے تین کمروں کے مختصر سے مکان میں اپنی بیوگی کے دن گزار رہی تھی۔ قرب و جوار میں چونکہ کوئی مکان نہیں تھا اس لئے وہاں رہنے والوں کو اس حادثے کی اطلاع نہ ہوئی لیکن دو ہفتے بعد جب لاش سڑی اور تعفن پھوٹا تو ایک شخص نے پولیس کو فون پر اپنے شبے کی اطلاع کر دی۔

پولیس اور جاسوسوں کی ٹولی جس وقت مسز بار کر کے مکان میں داخل ہوئی تو اس وقت ہر طرف تعفن پھوٹ رہا تھا۔ لاش بری طرح گل سڑ چکی تھی چہرے کی کھال

ادھڑی ہوئی ملی جس پر کیڑے چل رہے تھے۔ سب سے عبرتناک منظر وہ تھا جب پولیس والے لاش کے قریب پہنچے تھے اور انہوں نے ایک چوہے کو مقتولہ کی ایک آنکھ سے باہر نکلتے دیکھا تھا بعد میں پوسٹ مارٹم رپورٹ سے پتا چلا کہ قاتل نے پہلے بڑھیا کو بری طرح زدو کوب کر کے ختم کیا پھر اپنی جنسی درندگی کا مظاہرہ کر کے فرار ہو گیا۔ اس واقعے کے منظر عام پر آتے ہی عوام کی ایک بڑی تعداد پولیس کے خلاف کھلے عام نعرے لگانے لگی۔ اخبارات نے بڑے بڑے کالم لکھے اور ایک بار پھر پولیس کو اس کی نااہلی کا یقین دلانے کی کوشش کی۔ سراغرساں اور جاسوسوں کی ٹولی مسز پارکر کو پیش آنے والے حادثے سے بری طرح بوکھلا گئی تھی لیکن پولیس چیف کسی گہری سوچ میں گم نظر آ رہا تھا۔

"چیف ------" ایک ماتحت نے بجھی ہوئی آواز میں اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کا اس قاتل کے بارے میں کیا خیال ہے جو ہماری انتھک کوششوں کے باوجود ابھی تک آزادی کے ساتھ جرائم کا ارتکاب کر رہا ہے۔"

"میں اسے محض حالات کی ستم ظریفی کہوں گا لیکن اب میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ نیلے سوٹ والا گوریلا بہت جلد ہی ہماری گرفت میں آ جائے گا۔"

"کیا مسز پارکر کے سلسلے میں کوئی اہم کلیو مل گیا ہے۔"

"نہیں ------ مگر اتنا ضرور ہے کہ میرے ذہن میں ایک لائن آف ایکشن ایسی آ گئی ہے جو قاتل کو ہمارے ہاتھوں بے بس کر دینے کے لئے بہت موثر ثابت ہو گی ------"

"کیا آپ اپنے ذہن میں کوئی خاص اسکیم مرتب کر چکے ہیں۔"

"ہاں ------" پولیس چیف نے بڑے وثوق سے کہا "مجھے حیرت ہے کہ اب تک یہ طریقہ کار ہمارے ذہن میں کیوں نہیں آیا۔ اگر ہم نے اس پر عمل کیا ہوتا تو گوریلا صفت انسانی درندہ اب تک گرفتار ہو چکا ہوتا۔"

مسز پارکر کو پیش آنے والے حادثے کے ایک دن بعد سنگدل قاتل نے پورٹ لینڈ میں دوسرا حملہ کیا اور ایک عورت کو مار ڈالا جو اسے اپنا خالی مکان دکھانے کی

غرض سے اندر لے آئی تھی۔ اس حادثے نے پولیس کو اور بوکھلا دیا۔ سرحدی چوکیوں کی حفاظت کرنے والے دستوں کو سختی سے محتاط رہنے کی تاکید کر دی گئی۔ پولیس کو خدشہ تھا کہ اب قاتل سرحدی راستوں سے چوری چھپے کینیڈا میں داخل ہونے کی کوشش کرے گا۔ ابھی جاسوس اور سراغرساں سرحدی چوکیوں کی ناکہ بندی میں مصروف تھے کہ انہیں ایک بوڑھی عورت پر قاتلانہ حملے کی اطلاع ملی جو قاتل کے ہاتھ سے اتفاقیہ طور پر بچ گئی تھی۔

بوڑھی عورت نے پولیس کو بتایا کہ اس نے ایک شخص کو اپنا مکان کرائے پر دیا تھا جہاں اس نے محض ایک رات گزاری۔ دوسری رات جب مکان کی مالکہ اس سے ملنے گئی تو قاتل نے جو لانبے قد کشادہ شانے اور مضبوط قوی کا مالک تھا' اس پر اچانک حملہ کر دیا اور اس کا گلا دبانے لگا لیکن چند افراد کے بروقت آجانے کی وجہ سے قاتل فرار ہو گیا۔ پولیس نے قاتل کے اثاثے کی تلاشی لی تو ایک گٹھری سے بہت سارے زیورات برآمد ہوئے بعد کی تفتیش سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ برآمد ہونے والے زیورات وہی تھے جو قاتل نے مسز ولیم کو قتل کرنے اور اس کی عصمت دری کرنے کے بعد اس کے گھر سے چوری کئے تھے۔

اس موقع پر پولیس کے اعلیٰ افسران نے قاتل کے بارے میں اب تک ملنے والی اطلاعات اور حلئے کی تفصیلات کے سہارے اپنے مصور سے قاتل کا ایک فوٹو تیار کرایا جسے شہر کے گلی کوچوں' ہوٹلوں اور پارکوں میں جگہ جگہ چسپاں کرایا گیا اور عوام اور پولیس کو ایک بار پھر تاکید کر دی گئی کہ وہ اس پر اسرار مجرم سے محتاط رہیں اور اگر وہ انہیں کہیں نظر آ جائے تو پولیس کو فوری طور پر مطلع کریں یا پھر اگر اطلاع دینے کا موقع نہ ہو تو قاتل کو گولی مار دیں۔

ایک طرف پولیس اپنے حفاظتی اقدامات کو مستحکم کر رہی تھی لیکن دوسری طرف نیلے سوٹ والا گوریلا بڑی آزادی کے ساتھ عورتوں کو اپنا شکار بنا رہا تھا۔ 1927ء کے موسم بہار میں اس نے اپنا رخ مشرق کی طرف بدل دیا۔ 27 اپریل کو اس نے فلاڈلفیا کے مقام پر ایک چودہ سالہ نوجوان اور خوبصورت لڑکی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ لڑکی کی لاش اس کی خوابگاہ میں پڑی ملی۔ جس کے جسم پر لاتعداد گہرے زخم

نمایاں تھے۔ اس کا جسم گٹھری کی طرح سمٹ کر اکڑ چکا تھا۔ تفتیش سے یہی ظاہر ہوا کہ قاتل نے حسب معمول پہلے کمسن لڑکی کو اذیت پہنچا کر مارا پھر اس کے ساتھ منہ کالا کیا اور فرار ہوگیا۔

پولیس چیف اپنی سوچی سمجھی اسکیم پر برابر عمل کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ گوریلا صفت قاتل بہت جلد اس کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس کر بے بس ہو جائے گا لیکن اب تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ سنگدل قاتل اس تیزی سے ایک علاقے سے نکل کر دوسرے علاقے کی طرف جاتا تھا کہ پولیس چیف کا سارا منصوبہ خاک میں مل جاتا لیکن پولیس چیف برابر اپنے منصوبے پر عمل کرتا رہا۔ آخر 13 جون 1927ء کو وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہوگیا۔

وہ رات بیحد تاریک تھی جب نصف شب گزرنے کے بعد ایک ٹیکسی کینیڈا کے ایک ایسے مکان کے سامنے آ کر رکی جس کے بیرونی پھاٹک پر "کرائے کے لئے خالی" کا نیون سائن چمک رہا تھا۔ ٹیکسی سے برآمد ہونے والا ایک لانبے قد کا مالک تھا جس کے کاندھے غیر معمولی طور پر کشادہ تھے لیکن اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اپنی برساتی کے بڑے بڑے کالروں کو اس طرح اٹھا رکھا تھا کہ چہرے کا بیشتر حصہ چھپ گیا تھا۔ پیشانی کا تین چوتھائی حصہ اس کی فلیٹ کے اگلے گوشوں کے پیچھے روپوش تھا۔

ٹیکسی کا بل ادا کرنے کے بعد وہ تیزی سے مطلوبہ مکان کے احاطے میں داخل ہوا اور لمبے لمبے قدم مارتا صدر دروازے تک پہنچ گیا۔ پھر اس نے بغیر جھجک کے کال بیل بجائی اور اندر سے کسی کے برآمد ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ ایک منٹ بعد دروازہ کھلا اور شب خوابی کے لباس میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر کی عورت اس کے سامنے آ گئی۔

"کیا مسٹر جوزف گھر پر موجود ہیں۔" نووارد نے بڑے شستہ لہجے میں عورت سے دریافت کیا۔

"جی نہیں ——— مسٹر جوزف ایک ضروری کام کے سلسلے میں باہر گئے ہوئے ہیں۔ ان کی واپسی 3 گھنٹے سے پہلے ممکن نہیں۔"

"اوہ ———" نووارد نے تیزی سے کہا "کیا میں اتنی دیر اپنے پرانے دوست کا انتظار کر سکتا ہوں۔"

"بڑے شوق سے۔" عورت نے مسکرا کر جواب دیا پھر نووارد کو اندر آنے کا راستہ دے دیا۔

نووارد کے اندر داخل ہونے کے بعد عورت نے بیرونی دروازے کو بڑے اطمینان سے چٹخنی لگا دی پھر وہ جیسے ہی گھومی نووارد نے اچانک اس پر حملہ کر دیا اور اسے زمین پر گرا کر اس کے پیٹ اور چھاتیوں پر بھرپور مکے برسانے لگا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ملحق کمرے سے پولیس چیف اپنے ہمراہ آٹھ مسلح آدمی لئے برآمد ہوا اور قبل اس کے نیلے سوٹ والا گوریلا فرار ہونے کی کوشش کرتا۔ آٹھوں آدمیوں نے اسے جکڑ کر بے بس کر دیا۔ پولیس چیف کے ہونٹوں پر کامیابی کی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی درندہ صفت قاتل کو گرفتار کرنے کے لئے اس نے جو جال بچھایا تھا وہ آخر کار اس میں پھنس ہی گیا۔

نیلے سوٹ والا گوریلا ارل نیلسن جو برطانوی نژاد تھا اس وقت بھی اپنی برساتی کے نیچے نیلا دھاری والا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ گرفتاری کے بعد بھی وہ اپنی آزادی کی خاطر ہاتھ پاؤں مارتا رہا پھر جب اس نے محسوس کیا کہ اب اس کی آزادی کا زمانہ ختم ہوگیا ہے تو اس نے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش ختم کر دی اور اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لئے پولیس کے ساتھ سر جھکائے چلا گیا۔

گوریلا صفت قاتل کی گرفتاری کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل گئی۔ دور دراز کے علاقے کی عورتیں اسے ایک نظر دیکھنے کے لئے جمع ہوئیں۔ حیرت کی بات ہے کہ دو عورتوں نے بیک وقت نیلسن کی بیوی ہونے کا دعوی کیا۔ ان میں سے ایک جو سفید بالوں والی تھی۔ اس نے چند سال پہلے کینیڈا ہی میں نیلسن سے شادی کی تھی۔ پولیس کو اپنا بیان دیتے ہوئے اس نے بتایا کہ نیلسن کسی زمانے میں دیوانے پن کا مریض رہ چکا ہے۔ عورت نے بہتیری کوشش کی تھی کہ وہ اپنا باقاعدہ علاج کرا لے لیکن نیلسن نے ہر بار چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی تجویز رد کر دی۔

دوسری عورت جو کیلیفورنیا کی رہنے والی تھی اس نے بھی نیلسن کی بیوی ہونے کا دعویٰ کیا۔ اپنے بیان میں اس نے سسکیاں لیتے ہوئے پولیس کو بتایا:

"مجھے اس بات کے مطلق علم نہیں کہ نیلسن نے کوئی اور شادی بھی کی ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ جنسی جنونی تھا لیکن کم از کم اس نے مجھے کبھی کوئی گزند پہنچانے کی کوشش نہیں کی سوائے اس کے کہ جنسی فعل کے موقعوں پر وہ درندہ بن جاتا تھا۔ نیلسن میرے ساتھ صرف بیس روز رہا پھر وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔

"تصویریں جو پولیس کی طرف سے شائع کی گئی تھیں' میرے شوہر کی تھیں۔ مگر میں نے جان بوجھ کر پولیس کو اس راز سے مطلع نہیں کیا اور کرتی بھی کیسے جبکہ وہ میرا محبوب تھا۔"

گرفتاری کے ٹھیک دو ماہ بعد 13 اگست 1927ء کو نیلسن کو پھانسی کی سزا دے دی گئی۔ اس نے بلا جھجک ان تمام جرائم کا اقرار کیا جو اس پر عائد کئے گئے تھے۔

جس روز نیلسن کی موت کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی عوام اور پولیس دونوں اطمینان کا سانس لے رہے تھے۔ لیکن اس کی دوسری بیوی اس وقت بھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور چیخ چیخ کر لوگوں کو باور کرانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس کا شوہر بے گناہ تھا۔ وہ درندہ نہیں بلکہ ایک مہذب اور خلیق انسان تھا ______!!